بات میں لگ جائیں) یہاں اس غرض کی وضاحت اللہ کی آیات کے کفر اور ان کا مذاق اڑانے سے کی گئی ہے۔

یہاں خطاب اگرچہ واحد کے صیغہ سے ہے جس کا غالب قرینہ یہی ہے کہ خطاب آنحضرتؐ سے ہو لیکن یہ خطاب آنحضرتؐ کے واسطہ سے تمام مسلمانوں سے ہے۔ چنانچہ اشارۃً آگے بتا بھی دیا ہے کہ یہ خطاب معناً عام ہی ہے۔ چنانچہ بعد والی آیت میں یہ جو فرمایا کہ وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ کہ خدا سے ڈرنے والوں پر ان کافروں کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس نے اس خطاب کے پہلو کو واضح کر دیا کہ خطاب بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں سے ہے۔ پھر سورۂ نساء کی اس آیت میں جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے، صاف لفظوں میں بتا دیا کہ یہ خطاب عام ہی ہے۔ اس لیے کہ وہاں سورہ انعام کی اسی ہدایت کی بنا پر ان لوگوں پر گرفت فرمائی جنھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔

خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد ہے مگر عام ہے

اس ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں۔

اس ہدایت کے دو پہلو

ایک تو یہ کہ یہ رویہ اس حکمتِ دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت، اس کی تضحیک اور اس کی تردید کا بخار چڑھا ہوا ہو اور بخار کی شدت سے مریض کی کیفیت ہذیانی ہو رہی ہو عین اسی حالت میں اس کے سامنے اس چیز کو پیش کرنا گویا اس کے بخار اور ہذیان دونوں کو مزید بڑھا دینا ہے۔ اگر کوئی معالج مریض کی بیماری ہی میں اضافہ چاہتا ہو تو وہ تو آزاد ہے جو چاہے کرے لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہاں ہے وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ اسی رعایت احوال کے پیش نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے، طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو جب یہ بحرانی کیفیت ذرا دور ہو جائے تو اس وقت ان کو سنانے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا یہ کہ یہ اس غیرتِ حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ علانیہ خدا اور رسول کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اس سے لڑنا بھی ایک داعی کے لیے غلط، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور خاموش رہنا بھی غلط، اس لیے کہ اس سے وہ حمیت حق مجروح ہوتی ہے جو علامتِ ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخر درجہ بدرجہ آدمی کو اس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ، رسول، قرآن اور شریعت ہر چیز کی توہین و تذلیل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہے لیکن اس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہاں اس ہدایت کے اندر یہ دونوں ہی پہلو ملحوظ ہیں۔ پہلا تو سیاق کلام ہی سے واضح ہے اور دوسرے کو قرآن نے سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں واضح فرما دیا اس لیے کہ اسی ہدایت کا حوالہ دے کر وہاں منافقین پر گرفت فرمائی ہے کہ یہ لوگ مخالفین اسلام کی ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات

کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے حالانکہ ان کو قرآن میں اس سے روکا جا چکا ہے۔

شریعت کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ بیٹھنا بے غیرتی اور اس پر راضی رہنا نفاق ہے

'آیات' سے مراد یہاں ظاہر ہے کہ قرآن کی آیات ہیں اس لیے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان ہو رہا ہے ان کے سامنے قرآن ہی پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسی کو مذاق بنا رہے تھے لیکن یہی حکم بعینہٖ ساری شریعت اور اس کے سارے احکام کا ہوگا۔ شریعت کا مذاق جہاں بھی اڑایا جائے وہاں بیٹھنا بے غیرتی اور اس پر راضی رہنا نفاق اور کفر ہے۔

'وَاِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ' یہ اوپر والی ہدایت کی تاکید مزید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان اس بات سے غافل ہی کر دے تو یاد آجانے کے بعد ایسے ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ اس تاکید کی ضرورت اس لیے تھی کہ بسا اوقات آدمی کسی مجلس میں جا پہنچتا ہے اور وہاں بات بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ دین و شریعت کے استہزا تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں آدمی محسوس تو کرتا ہے کہ اب یہ جگہ بیٹھنے کی نہیں رہی لیکن خیال کرتا ہے کہ بھری مجلس سے کس طرح اٹھ کر چلا جائے۔ یا اگر مناظر قسم کا ہوتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ اب میدان چھوڑ کر کس طرح وہاں سے ہٹ جائے، حریف کیا کہے گا۔ یہ دونوں ہی خیال آدمی کے لیے فتنہ ہیں۔ اگر مجلس کا پاس و لحاظ مانع ہے تو یہ قلت غیرت کی دلیل ہے۔ آدمی سوچے کہ اگر اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو کیا وہ اس کو خاموشی سے گوارا کرے گا تو خدا اور اس کی شریعت کا حق تو ماں باپ بلکہ تمام دنیا جہان سے بڑا ہے۔ اور اگر وہ بحث و مناظرہ کے لیے وہاں جما رہے گا تو گو اس کی نیت احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہی کی ہو لیکن جب ان لوگوں کے ذہن خراب ہو چکے ہیں جن کو بات سنانی ہے اور ان کو سنانا ان کو مزید اشتعال دلانے کے مترادف ہے تو اس کا ایسے لوگوں کے ساتھ الجھنا صرف مونچھ کی لڑائی بن کر رہ جائے گا۔ مقصد حق کو اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی تقویت نہیں پہنچے گی بلکہ الٹا اس سے شدید قسم کا نقصان پہنچے گا۔ اس وجہ سے صحیح روش یہی ہے کہ آدمی اس کو شیطان کا چکمہ سمجھے اور ایسی مجلس سے کان جھاڑ کے اٹھ آئے۔

یہ بات یہاں یاد رہے کہ 'اِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطٰنُ' کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان کسی چکر میں ڈال کر ایسی صورتِ حال سے دوچار کرا ہی دے یا ایسے ظالموں سے بھڑا ہی دے تو تمھیں یہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اول تو آدمی برابر چوکنا رہے کہ شیطان اس کو اس طرح کے فتنہ میں ڈالنے نہ پائے لیکن اگر وہ کہیں اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر کے کسی فتنے میں ڈال ہی دے تو آدمی متنبہ ہوتے ہی ایسی مجلس کو سلام کرے اور وہاں سے چل دے۔ اس لیے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا مذاق اڑائیں وہ اپنی جانوں پر سب سے بڑا ظلم ڈھانے والے ہیں اور ان کی معیت معلوم نہیں خدا کے کس غضب میں مبتلا کر دے۔

'وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰکِنْ ذِکْرٰی لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ' یہ مسلمانوں کو تسلی اور

مسلمانوں کو تسلی اور حکمتِ تبلیغ کی تلقین

تبلیغِ دین کے معاملے میں اس نقطۂ اعتدال اور طریقۂ حکمت کو اختیار کرنے کی تلقین ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے اوپر ان کافروں اور ظالموں سے متعلق جو ذمہ داری ہے وہ صرف اللہ کی دعوت اور اس کے دین کو پہنچا دینے کی ہے تاکہ جس طرح وہ خدا سے ڈرنے والے ہیں اسی طرح یہ کفار بھی خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے۔ یہ اگر ایمان لائیں گے تو اس کا صلہ خود پائیں گے اور اگر کفر پر اڑے رہیں گے تو قیامت کو اللہ کے حضور جواب وہ خود نہیں گے۔ مسلمانوں سے جب کہ انھوں نے خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ادا کیا، کوئی مواخذہ ان سرکشوں کے باب میں نہیں ہوگا کہ یہ لوگ خدا سے ڈرنے والے کیوں نہ بنے؛ خدا کے ہاں کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داریوں سے متعلق مسئول نہیں ہوگا۔ خدا سے ڈرنے والوں پر جو ذمہ داری دوسروں کے باب میں عائد ہوتی ہے وہ صرف تبلیغ و تذکیر کی ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے یہ کافی ہے کہ اہلِ ایمان جب دیکھیں کہ کوئی سازگار موقع ان کے کانوں میں بھی بات ڈال دینے کا ہے تو ان کو اللہ کی بات پہنچا دیں۔ اپنے آپ کو ان کی ہدایت و ضلالت کا مسئول سمجھ کر ان کے تعاقب کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ مائدہ کی آیت ١٠٥ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ الآیۃ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔

اس آیت سے کئی باتیں واضح ہوئیں جو ذہن میں رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ اوپر والی آیت میں خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد تھا لیکن کلام کا رخ مسلمانوں کی طرف تھا۔ چنانچہ کلام کے تدریجی ارتقا سے یہ حقیقت خود واضح ہو گئی اور یہی قرآن کا معروف اسلوب ہے۔

دوسری یہ کہ اس سے اس جوشِ دعوت و تبلیغ کا اظہار ہو رہا ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر پایا جاتا تھا۔ آیت سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ صحابہؓ کو شہادتِ حق کی ذمہ داری کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگوں نے ہدایت نہ قبول کی تو شاید آخرت میں یہ ان کی کوتاہیٔ خدمت میں محسوب ہو۔

تیسری یہ کہ اس سے دعوت و تبلیغ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آیت سے صاف واضح ہے کہ اہلِ ایمان سے مواخذہ تو نہیں ہوگا کہ لوگوں نے ہدایت قبول کیوں نہیں کی لیکن یہ مواخذہ ان سے ہوگا کہ انھوں نے لوگوں کو تذکیر و تبلیغ کی یا نہیں۔

بازی بازی بارِیش بابا ہم بازی

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ ’دین‘ سے مراد یہاں وہ دین ہے جو اللہ نے ان کے لیے اتارا تھا اور جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ ان لوگوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے شامت زدہ ہیں کہ جس چیز کو اللہ نے ان کے دین کی حیثیت سے اتارا ہے اس کا مذاق اڑائیں ان سے کس خیر کی امید رکھتے ہو؛ ان کو چھوڑو، ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی! جو لوگ زندگی کے معاملے میں اتنے غیر سنجیدہ، اتنے بے فکر اور ایسے لاابالی ہیں کہ دین کو بھی وہ اپنے مسخراپن کا موضوع بنا لیں۔ ان کو مطمئن کرنے کے لیے فکر مند ہونے

کی ضرورت نہیں۔

منکرین کا اصل مغالطہ

وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا یہ ان کی اس ساری شرارت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ اصل چیز جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے وہ تو اس دنیا کی، ان کے زعم کے مطابق، وہ کامیاب زندگی ہے جو ان کو حاصل ہے اور جس میں وہ مگن ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کھا رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں اور دندنا رہے ہیں، اور کہیں سے ان کے اطمینان میں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اگر ان کی زندگی غلط ہے، جیسا کہ قرآن کہہ رہا ہے، تو پھر وہ تباہ کیوں نہیں کر دیے جاتے؟ اور جب وہ یہاں مسلمانوں سے بہتر حالت میں ہیں تو بالفرض موت کے بعد اٹھنا ہی ہوا تو آخر وہ آخرت میں کیوں اچھے نہیں رہیں گے؟ ان کا اصلی مغالطہ یہی ہے کہ جب ہماری زندگی کامیاب ہے تو ہمارا رویہ بھی لازماً صحیح ہے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو کل کی زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ زندگی چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہی ہے بلکہ امتحان و آزمائش کے اصول پر چل رہی ہے، یہاں حق کے ساتھ خدا نے باطل کو بھی ڈھیل دے رکھی ہے، اس وجہ سے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی میں باطل ہی کو اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی رویہ صحیح ہے اور قرآن ان کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے وہ محض ایک موہوم ڈراوا ہے۔

وَذَكِّرۡ بِهٖۤ اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا كَسَبَتۡ 'بہ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا اوپر آیت ۶۸ میں ذکر ہے۔ 'ابسلہ'، اسلمہ للھلکۃ، اس کو ہلاکت کے حوالہ کیا۔ ابسل فلانا لعملہ و بہ وکلہ الیہ، فلاں کو اس کے عمل کے حوالہ کر دیا۔ 'ان' سے پہلے عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق مضاف لفظ 'مخافۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ محذوف ہے۔ اس کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس قرآن کے ذریعے سے تذکیر کرو، نہ ہو کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اس قرآن کے ذریعے سے یاددہانی کرو، نہ ہو کہ کوئی جان اپنی کرتوت کے حوالہ کی جائے یا اپنی کرتوت کے بدلے رہن ہو کے رہ جائے۔ دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہ ہوگا۔

تذکیر کے لیے قرآن کافی ہے

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دین کو مذاق بنائے ہوئے ہیں نہ زیادہ ان کے درپے ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے نت نئے مطالبات کے لیے فکرمند ہونے کی، بس اسی قرآن کے ذریعہ سے اپنا فرض تذکیر و تبلیغ جو تم پر عائد ہوتا ہے، ادا کرتے رہو کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں گرفتارِ عذاب نہ ہو۔

تمہارا فریضہ لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دینا ہے کہ آگے کی منزل میں ہر ایک کو اپنے عمل سے سابقہ پیش آنا ہے۔ عمل ہی ہلاک کرے گا اور عمل ہی نجات دے گا۔ نہ کوئی کسی کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع و سفارشی اور نہ کسی کے پاس کوئی معاوضہ دینے کو ہوگا اور نہ کسی کا کوئی بڑے سے بڑا معاوضہ قبول ہوگا۔ اس خطرے سے آگاہ کر دینا ضروری ہے تاکہ کوئی بے خبری میں اپنے ہی عمل کی گرفت میں نہ آ جائے۔ اس آگاہی کے بعد اگر کوئی خود اپنی شامتِ اعمال میں گرفتار ہونا چاہتا ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔

تم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو۔ جو لوگ اس آگاہی کی پروا نہیں کریں گے وہ اپنی کرتوتوں کے حوالے ہوں گے اور ان کے کفر کی پاداش میں ان کے لیے کھولتا پانی پینے کو اور عذاب دردناک ہوگا۔

اہل دوزخ کے لیے اولین سامانِ ضیافت

"کھولتے پانی" کا ذکر یہاں بطور نُزُل یعنی اولین سامانِ ضیافت کے ہے، جیسا کہ دوسری جگہ اس کی تصریح ہے وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۹۳ واقعہ (اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو اس کے لیے اولین سامان ضیافت کھولتا ہوا پانی ہوگا) یعنی وہاں اترتے ہی پہلی ضیافت تو ان کی ماءِ حمیم سے ہوگی پھر اس کے بعد ان کے لیے عذابِ الیم کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

'وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ' کا صحیح زور سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قیامت کے دن مجرمین یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ اپنی اولاد، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے خاندان اور ساری دنیا کو فدیہ میں دے کر اس عذاب سے چھوٹ جائیں لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوگی۔ ملاحظہ ہوں آیات ۱۱-۱۴ سورۂ معارج۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۪ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (۷۱-۷۳)

خدا کی ہدایت آجانے کے بعد کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا

قُلْ اَنَدْعُوْا .... بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا کہ یہ لوگ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ تمہیں پھر اسی گمراہی میں پھنسائیں جس سے خدا نے تمہیں نکالا ہے تو تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جن کو نہ ہمیں نفع پہنچانے پر کوئی اختیار نہ ضرر پہنچانے پر اور اس طرح ہم الٹے پاؤں پھر اسی گمراہی میں جا گریں جس سے خدا نے ہمیں نکلنے کی توفیق بخشی اور ہماری رہنمائی فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے ہم اس گمراہی میں مبتلا رہے تو اس کے لیے کچھ عذر تھا لیکن اب اگر ہم رجعت اختیار کریں گے تو ہمارے پاس کیا عذر ہوگا؟ 'مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا' میں ان معبودوں کے لیے 'مَا' کا لفظ ان کی تحقیر پر دلیل ہے اور نفع و ضرر کی نفی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ اس لیے کہ ان چیزوں میں سے اگر کسی چیز نے نفع و ضرر پہنچایا ہے تو اللہ کے حکم سے پہنچایا ہے نہ کہ ان میں سے کوئی چیز بذاتِ خود یا باختیار خود نافع و ضار ہے۔ 'بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' مخاطبوں کے لیے نہایت مؤثر موعظت بھی ہے کہ اس آفتابِ ہدایت کے طلوع ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ خود ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی ٹھوکریں کھلانا چاہتے ہیں وہ ذرا اپنے انجام پر غور کریں۔

كَالَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَی الْهُدَی ائْتِنَا۔

'استھواء' کے معنی کسی کی عقل گم کر دینا، ہوش اڑا دینا، حیران و درماندہ کر دینا۔ 'ارض' کے معنی یوں تو زمین کے ہیں لیکن یہاں گم گشتگی کی تمثیل بیان ہو رہی ہے اس وجہ سے قرینہ بتا رہا ہے کہ اس سے مراد صحرا و بیابان ہے جہاں راہ بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ فعل 'استھوا' کی نسبت شیاطین کی طرف اس مفہوم کے اعتبار سے ہے جو تمثیل میں مضمر ہے۔ یہ تمثیل ایمانی و اخلاقی گم گشتگی کی ہے جس میں زیادہ دخل شیاطین جن و انس کا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے فعل کی نسبت شیاطین کی طرف کر کے اصل حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا۔ 'ھُدای' کے معنی تفسیر سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ سیدھی راہ کے بھی آتے ہیں۔

مخالفینِ اسلام کی تمثیل

یہ اوپر والے ٹکڑے 'وَنُرَدُّ عَلٰۤی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت الٰہی کی شاہراہ پا جانے کے بعد اگر ہم تمہارے کہے پر چلے اور مڑ کے اس کفر و شرک میں پھر مبتلا ہو گئے جس سے خدا نے ہمیں نکالا ہے تو ہماری مثال بالکل اس شخص کی ہو گی جس کو شیاطین نے کسی صحرا میں بھٹکا دیا ہو، وہ حیران و درماندہ ادھر ادھر پھر رہا ہو، اس کے کچھ ساتھی اس کو پکار رہے ہوں کہ راستہ ادھر ہے، ہماری طرف آجاؤ لیکن اس کی عقل ایسی گم ہو کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ کدھر جائے۔

اس تمثیل کا اسلوب اگرچہ بظاہر ایک عمومی تمثیل کا ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فی الحقیقت یہ ان مخالفین اسلام کی تمثیل ہے جو یہاں زیر بحث ہیں۔ اس تمثیل میں ان کے سامنے یہ بات رکھی گئی ہے کہ تم صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی مانند ہو، شیاطین اور گمراہ لیڈروں نے تمہاری مت مار دی ہے اور تمہارے کچھ راہ یاب ساتھی (اشارہ اہل ایمان کی طرف ہے) تمھیں اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں لیکن تم ان کی پکار نہیں سن رہے ہو —— دیکھیے کس خوبی کے ساتھ ان کی پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ حکایت بظاہر دوسروں کی لیکن بات ساری کی ساری ان کی۔

'قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى' یعنی ان کو بتا دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے تو اللہ کی ہدایت پا جانے کے بعد اب ہم کسی اور طریقے کی پیروی کس طرح کر سکتے ہیں؟

'وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' یہ مشرکین کی دعوت شرک کا جواب ہے کہ تم ہمیں ان چیزوں کی پرستش کی دعوت دے رہے ہو جو نہ ہمیں نفع پہنچائیں نہ نقصان پہنچا سکیں اور حکم ہمیں اللہ رب العالمین کے آگے سر فگندگی اور حوالگی کا ہوا ہے۔ یہاں لفظ 'امر' کے بعد 'ل' اس امر کے موکد ہونے کو ظاہر کر رہا ہے اور 'رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کی صفت اس امر موکد کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی تمام عالم کا رب ہے تو اس کے سوا کون حقدار ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کیا جائے۔

'وَاَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ' یہ 'اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کے تحت اور اسی کی عملی تصویر ہے لیکن اسلوب غائب سے بدل کر حاضر کا کر دیا گیا ہے جس سے

اس کے اندر براہ راست خطاب کا زور پیدا ہو گیا ہے۔ نماز کا ذکر یہاں اس اسلام کے اولین عملی مظہر کی حیثیت سے ہوا ہے جس کا ذکر 'وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' میں ہے۔ 'تقویٰ' یہاں ان تمام حدود کی پابندی کے مفہوم میں ہے جن کی پابندی کا خدا نے حکم دیا ہے۔ 'وَاِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ' میں آخرت اور توحید دونوں چیزیں جمع کر دی گئی ہیں اور یہ اوپر والے احکام کی دلیل ہے کہ نماز کا قیام اور حدودِ الٰہی کا احترام اس لیے لازم ہے کہ ایک دن خدا کے آگے حاضر ہونا ہے اور صرف اسی کے آگے حاضر ہونا ہے۔ اس دن کوئی اور مرجع و مولیٰ نہیں ہو گا۔ 'وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ الایۃ' یہ ایک نہایت جامع آیت ہے جس میں نہایت مختصر الفاظ میں اوپر والے ٹکڑے 'ھُوَ الَّذِیْٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ' کے ہر جزو کی دلیل بیان ہو گئی ہے۔

کارخانۂ کائنات کے 'بالحق' ہونے کا لازمی نتیجہ

آسمان و زمین میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار و دلائل موجود ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے جو اس نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو بلکہ یہ ایک قدیر، علیم، حکیم اور رحمان و رحیم ذات کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اگر یہ یونہی چلتی رہے، اس کے اندر جو ظلم ہے اس کے انصاف کے لیے کوئی دن نہ آئے، جو عدل ہے اس کی داد کا کوئی وقت نہ آئے، اس کے اندر جو برے، شریر اور بدکار ہیں ان کو کوئی سزا نہ ملے، جو نیک، حق شناس اور عدل شعار ہیں ان کو ان کی نیکیوں کی جزا نہ ملے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سارا کارخانہ بالکل عبث، بے غایت اور باطل ہے جس کے بنانے والے کے نزدیک خیر اور شر، ظلم اور عدل، حق اور باطل میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ بات انسان کی عقل و فطرت کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتی اس لیے کہ جس خالق کی خلقت کے ہر گوشے میں اس کی حکمت، قدرت، رحمت اور ربوبیت کے آثار موجود ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ انسان کسی طرح ان کا احاطہ نہیں کر سکتا اس کی نسبت وہ کس طرح یہ باور کر لے کہ اس کو ہماری نیکی بدی اور ہمارے عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اگر بحث ہے اور ضرور بحث ہے اس لیے کہ یہ بحث نہ ہو تو یہ دنیا بالکل کھیل بلکہ نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اس دنیا کے لیے ایک یوم انصاف آئے جس میں خدا کی کامل رحمت اور اس کی کامل حکمت ظاہر ہو اور ہر نیکی اپنا صلہ پائے اور ہر بدی اپنی سزا۔

'وَیَوْمَ یَقُوْلُ کُنْ فَیَکُوْنُ، قَوْلُہُ الْحَقُّ' یعنی کوئی اس وہم میں مبتلا نہ ہو کہ اس دن کے لانے میں خدا کو کوئی دشواری پیش آئے گی۔ جس نے یہ دنیا مجرد اپنے حکم 'کن' سے بنائی ہے وہ جب حشر برپا کرنا چاہے گا تو اسی کلمۂ 'کن' سے حشر بھی برپا کر دے گا۔ آخر جب اس کو پہلی بار دنیا کے پیدا کر دینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی تو دوبارہ کیوں پیش آئے گی؟ 'قَوْلُہُ الْحَقُّ' میں 'حق' کے معنی شدنی کے ہیں یعنی خدا کی ہر بات ہو کے رہتی ہے۔ اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی۔

'وَلَہُ الْمُلْکُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ' یعنی جس دن حشر کے لیے صور پھونکا جائے گا اس دن سارا اختیار اور ساری بادشاہی صرف خدائے واحد و قہار ہی کی ہو گی۔ اس دن نہ کسی کا کوئی زور چلے گا'

نہ کسی کو کوئی اختیار حاصل ہوگا، نہ کسی کی سعی و سفارش اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکے گی۔ سب خدا کے آگے سرافگندہ ہوں گے صرف اسی کا حکم ناطق و نافذ ہوگا۔

'عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ' وہ سارے غائب و حاضر کا علم رکھنے والا ہے اس وجہ سے نہ کسی کی کوئی ظاہر یا پوشیدہ بات اس سے مخفی ہوگی، نہ وہ کسی سے کوئی بات پوچھنے کا محتاج ہوگا، نہ کوئی اس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے گا، نہ کوئی غلط فہم کا عذر کر سکے گا۔

'وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ' وہ حکیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کا ہر فیصلہ عدل، حکمت اور علم و خبر پر مبنی ہو۔ نہ اس کے عدل و حکمت میں کوئی نقص ہے کہ وہ کسی باطل کو حق اور حق کو باطل بنا دے۔ نہ اس کے علم و خبر میں کوئی خلا ہے کہ لاعلمی اور بے خبری کے سبب سے کسی مغالطے میں پڑ جائے یا کوئی اس کو مغالطہ میں ڈال کر حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۷۴-۹۰

سورہ کے شروع سے جو بحث چلی آ رہی تھی یہاں آ کر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ اب آگے حضرت ابراہیمؑ اور ان سے پہلے اور ان کے بعد پیدا ہونے والے تمام نبیوں کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ ان سب کی دعوت یہی تھی جو یہ پیغمبر دے رہے ہیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم بہر شکل انہی ہدایت یافتہ گروہ کی ہدایت کی پیروی کرو۔ اگر تمہاری یہ قوم تمہاری بات نہیں سنتی تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، تمہاری ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے۔ ان کے دلوں میں ایمان و ہدایت اتار دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں خاص اہمیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعوتِ توحید کا ذکر فرمایا ہے جو بالکل ابتدا ہی میں انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی دعوت کے خاص طور پر ذکر کی وجہ، جیسا کہ ہم تفسیر سورۂ بقرہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، یہ ہے کہ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں ہی ان کو مسلم طور پر اپنا خاندانی بزرگ اور روحانی پیشوا مانتے تھے اور مدعی تھے کہ جس دین پر وہ ہیں ان کو انہی سے وراثت میں ملا ہے اور اپنی تمام مشرکانہ بدعات میں انہی کے نام نامی کو بطور سند پیش کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی چونکہ ملتِ ابراہیمؑ پر ہوئی تھی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح بقرہ اور آل عمران میں بنی اسرائیل پر یہ واضح کر دیا گیا کہ ان کی ایجاد کردہ یہودیت و نصرانیت کو ملت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح بنی اسمٰعیل پر بھی یہ واضح کر دیا جائے کہ انھوں نے جو دین شرک اختیار کر رکھا ہے یہ ان کی اپنی ایجاد ہے، حضرت ابراہیمؑ سے اس کو کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں حضرت ابراہیم کی دعوت اور ان کی زندگی کے ہر پہلو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو سبق حاصل ہو سکتے تھے وہ کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ آپ اسی ملت حنیفا کی تجدید و تکمیل کے لیے آئے تھے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی اور اسی قوم کے اندر آئے تھے جو حضرت ابراہیم کی نام لیوا تھی۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۴-۹۰

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلٰلٍ مُبِينٍ ﴿٧٤﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِي إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأٰ كَوْكَبًا ۖ قَالَ هٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّينَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّي هٰذَا أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٧٨﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾ وَحَآجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَآجُّونِّي فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَآءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۚ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوٓا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾

وقف لازم

ع ۹ / ۱۴ / ۱۵

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ
اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝۸۳ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا
هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ
وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰي وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۸۴
وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰي وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۸۵ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۶ وَمِنْ
اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ
اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۸۷ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۸۸
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ
بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝۸۹
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔـلُكُمْ
عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ ۝۹۰

ع ۱۰ / ۸ / ۱۶

ترجمۂ آیات ۷۴-۹۰

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا، کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو، میں تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور کاملین یقین میں سے بنے۔ ۷۴-۷۵

پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانک لیا اس نے ایک تارے کو دیکھا،

بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا بولا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا اس نے کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا بولا کہ یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو اپنا رُخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ۷۶ - ۷۹

اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے جواب دیا کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، درآنحالیکہ اس نے میری رہنمائی فرمائی ہے۔ اور میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ تو کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے؟ اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو اور تمھارا حال یہ ہے کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے باب میں اس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری۔ تو ہم دونوں گروہوں میں سے امن و اطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے، اگر تم جانتے ہو؟ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن اور چین ہے اور وہی راہ یاب ہیں۔ ۸۰ - ۸۲

یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم پر قائم کرنے کے لیے بخشی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ بیشک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔ اور ہم نے اس کو

اسحٰق اور یعقوب عطا کیے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت بخشی اس سے پہلے اور اس کی ذرّیت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی، یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے اور اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے عالم والوں پر فضیلت بخشی۔ اور ان کے آباؤ اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے اور ان کو برگزیدہ کیا۔ اور ان کو ہم نے صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کے رہ جاتا۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور قوتِ فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی تو اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں گے تو کچھ پروا نہیں ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کر دیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو۔ اعلان کر دو، میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں۔ یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ ۸۳-۹۰

۱۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۷۴)

آزر کے نام کے بارے میں روایات کا اختلاف

آزر، حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے۔ تورات کے عربی اور انگریزی ترجموں اور تالمود، سب میں اس کا تلفظ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قرآن نے یہاں جس تصریح کے ساتھ اس نام کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے ہاں روایات کا جو اختلاف ہے وہ اس کو رفع کرنا چاہتا ہے اور قرآن چونکہ قدیم صحیفوں کے لیے کسوٹی (مہیمن) کی حیثیت رکھتا ہے اور براہِ راست وحی الٰہی پر مبنی ہے اس وجہ سے ماننا چاہیے کہ یہی نام صحیح ہے۔

انبیاء کی دعوت کا ایک عام اسلوب

یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزر صرف بت پرست ہی نہیں بلکہ بت گر اور بت فروش بھی تھے بلکہ عجب نہیں کہ بت خانے کے پروہت بھی رہے ہوں۔ ایسے حالات میں آزر کے گھر میں ابراہیمؑ کا پیدا ہونا اور باپ کے سارے کاروبار بت پرستی و بت فروشی پر بیٹے ہی کے ہاتھوں یہ ضرب کاری لگنا قدرتِ الٰہی کا ایک کرشمہ ہے۔ حضرات انبیاء کی صداقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ انھوں نے جس حق کی دعوت دنیا کو دی ہے اس کی اذان سب سے پہلے ان کے کانوں میں دی ہے جو ان کے سب سے زیادہ قریب بھی تھے اور ان کو سب سے زیادہ عزیز بھی۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو جو دعوت دی ہے اس کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ	یاد کرو جب اس نے اپنے باپ سے کہا۔ اے میرے
مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ	باپ، آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنتی ہیں
شَیْـًٔا ۝ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ	نہ دیکھتی ہیں اور نہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ اے
مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ	میرے باپ، میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے
اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ۝ یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ	پاس نہیں آیا تو میری پیروی کیجیے میں آپ کو سیدھی راہ
الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ	دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے۔
عَصِیًّا ۝ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ	شیطان خدائے رحمان کا بڑا نافرمان ہے۔ اے میرے
عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ	باپ میں ڈرتا ہوں کہ آپ کو خدائے رحمان کی طرف سے
وَلِیًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ	کوئی عذاب نہ آپکڑے کہ آپ شیطان کے ساتھی بن کے
اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ	رہ جائیں۔ اس نے جواب دیا، ابراہیم! کیا تم میرے
تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ	معبودوں سے منحرف ہو رہے ہو۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں
مَلِیًّا ۝	تمھیں سنگسار کر دوں گا۔ اب تم میرے پاس سے یک دم
(۴۲-۴۶ سورۂ مریم)	دفع ہو جاؤ۔

اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً یعنی اپنے ہی ہاتھوں کے گھڑے ہوئے بت اور ان کو معبود بنا ڈالا ہے، یہ تو ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں آپ بھی مبتلا ہیں اور آپ کی قوم بھی! دوسری جگہ فرمایا ہے اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ ۹۵۔ صافات (کیا تم پوجتے ہو ان چیزوں کو جن کو خود اپنے ہی ہاتھوں گھڑتے ہو)

وَكَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ۔ (۷۵)

وَكَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ ، دوسرے مقام میں ہم اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ دراصل كُنَّا نُرِیْ اِبْرٰهِیْمَ ہے۔ عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق یہاں كُنَّا محذوف ہو گیا ہے۔

لفظ 'ملکوت' کی تحقیق

'مَلَكُوْت' جس طرح 'رہبۃ' سے 'رہبوت' ہے اسی طرح 'ملک' سے 'ملکوت' ہے۔ 'ملکوت' کا لغوی مفہوم تو عزت و اقتدار، بادشاہی اور سلطنت ہے لیکن قرآن میں یہ لفظ خدا کی اس تکوینی بادشاہی کے لیے استعمال ہوا ہے جو آسمان اور زمین بلکہ ہر چیز پر قائم و دائم ہے۔ اس 'ملکوت الٰہی' پر غور کرنے کی دعوت مختلف اسلوبوں سے قرآن میں بار بار دی گئی ہے اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۱۸۵- اعراف (کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین میں خدا کی بادشاہی پر غور نہیں کیا) سُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۸۳- یٰس (پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

ملکوتِ الٰہی میں تفکر تمام علم کی کلید

یہاں یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق بخشی سے ان پر اپنی معرفت کے وہ اسرار و حقائق کھولے جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم پر واضح کیے۔ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اسی ملکوت پر غور کرنے سے وہ کلید ہاتھ آتی ہے جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی سے زندگی کا سرا بھی ہاتھ آتا ہے اور اسی سے اس کے منتہا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس دنیا کا کوئی خالق ہے یا یہ خود ہی آدھمکی ہے؟ اگر کوئی خالق ہے تو وہ یکہ و تنہا ہے یا اس کے اور بھی شریک و سہیم ہیں؟ یہ پیدا ہو کر کبھی ختم ہو گی یا اسی طرح ہمیشہ ہمیش چلتی رہے گی؟ اگر اس کا کوئی خالق و مالک ہے تو اس کی صفات و خصوصیات کیا ہیں اور کس لیے اس نے اتنا بڑا عالم کھڑا کر دیا ہے؟ اس دنیا میں حق و باطل کے لیے کوئی معیار ہے یا یہ کوئی اندھیر نگری ہے؟ انسان اپنے اقوال و افعال کے لیے مسئول اور جواب دہ ہے یا بالکل مطلق العنان اور شتر بے مہار ہے؟ آسمانوں اور زمین میں ایک ہی قادر و قیوم کی تدبیر و حکمت کارفرما ہے یا ان کے اندر الگ الگ مشیتیں اور الگ الگ ارادے زور آزمائی کر رہے ہیں؟ یہ اور اس قبیل کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کے صحیح حل پر ہی صحیح فکر اور صحیح عمل کی بنیاد ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے آسمان و زمین کے اس نظام پر غور کرنے کی دعوت بھی دی ہے اور صحیح نتائج تک پہنچنے میں ہمارے فکر کی رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے اس ملکوت پر غور تو ایک سائنس دان بھی کرتا ہے لیکن وہ سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف اپنے نفع عاجل پر ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ان حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اس کی نگاہ کو اس کے مطلوب نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اس سے گل قند یا اسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس چکر میں نہیں پڑتا کہ اس پھول کے حسن و جمال، اس کی رعنائی و دل کشی، اس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اس کے صانع کی قدرت، کاری گری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور ان جلووں سے بے خود

ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

حالانکہ ایک صاحبِ نظر کے لیے پھول کا یہی پہلو زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل قندہی ہوتا تو صرف اس مقصد کے لیے اس کی ایک ایک پنکھڑی پر قدرت کو اس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ گل کاری اور صنعت گری تو اسی لیے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفتِ کردگار کے دفتر کا کام دے۔

نیوٹن نے سیب کے درخت سے ایک سیب زمین پر گرتے دیکھا۔ اس سے اس کا ذہن زمین کی کشش کے اصول کی طرف منتقل ہو گیا۔ پھر اس اصول سے بہت سے اصول دریافت ہو گئے جو علمی تحقیقات و انکشافات میں بہت کارآمد ثابت ہوئے لیکن نگاہ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس اصول کی تمام کارفرمائیاں بس اسی دنیا کی تنگ نائے کے اندر محدود رہ گئیں۔ ورنہ یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے کائنات کی ایک ایک چیز کو خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، جذب و کشش کے اس قانون سے باندھ رکھا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایماندارانہ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ یہ سارا کارخانہ ایک غالب و مقتدر اور ایک حکیم و علیم کا بنایا ہوا ہے لیکن اس سوال اور اس کے جواب سے چونکہ بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عاید ہوتی ہیں اس وجہ سے ہمارے سائنس دان اس سے بھاگتے ہیں۔

حضراتِ انبیاء کی بلند نگاہی

زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان و زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے" تو اس سے اسی بلند نگاہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی ہدایت سے حضرات انبیاء کرام کو بالخصوص حاصل ہوتی ہے اور بقدر استعداد اس توفیق میں سے وہ لوگ بھی حصہ پاتے ہیں جو ایمان دارانہ اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور اپنے غور و فکر کے نتائج سے گریز کے بجائے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا میں اسی گروہ کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ یہاں عربی زبان کے اس معروف قاعدے کے مطابق جس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، معطوف علیہ محذوف ہے جس کا تعین قرینہ کرے گا۔ یہاں آگے وضاحت موجود ہے کہ اس مشاہدۂ ملکوت سے اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنی وحدانیت کی اس دلیل کی طرف رہنمائی فرمائی جو انھوں نے اپنی قوم پر قائم فرمائی۔ چنانچہ فرمایا ہے وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرٰهِيمَ عَلٰى قَوْمِهِ (اور یہ ہے ہماری وہ دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی) اس قرینہ کی روشنی میں اگر اس محذوف کو کھولا جائے تو پوری بات یوں ہو گی کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور تاکہ وہ اہل یقین میں سے بنے۔"

یقین کے مدارج

یہاں جس 'یقین' کا ذکر ہے یہ وہ یقین ہے جو ایمان کے اوپر کا درجہ ہے جس کو حق الیقین سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایمان ایک عام چیز ہے جس کے لیے اگر فطرت سلیم ہو تو اندر کا وجدان بھی کافی ہوتا ہے لیکن یقین، فکر و نظر، تفکر و تدبر اور ملکوت الٰہی کے علم و مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مراتب و مدارج کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے چنانچہ آگے نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ میں اسی کے مراتب عالیہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی یقین جب ایمان کے اندر پیدا ہوتا ہے تب اس کا فیضان متعدی ہوتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات اس سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں۔ حضرات انبیا چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ اس میں سے حصۂ وافر پاتے ہیں اور پھر ان کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہوتا ہے جو ان کے متبعین باحسان میں شامل ہوتے ہیں۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۷۶-۷۹)

ان آیات میں لغت یا اسلوب زبان کا کوئی اشکال نہیں ہے۔ نظم کے پہلو سے یہ اوپر والی آیات کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پہلے حوالہ دیا کہ کس طرح ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے دین کے کھوکھلے پن کو ان کے سامنے بے نقاب کیا اور ان کی کھلی ہوئی گمراہی پر ان کو ملامت کی۔ پھر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح ہم ابراہیم علیہ السلام پر آسمان و زمین میں اپنی ملکوت کے اسرار و حقائق بے نقاب کرتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر ہماری حجت تمام کرے اور تاکہ وہ کاملین یقین میں سے بنے۔ اس کے بعد اب یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ ابراہیمؑ نے کس طرح اپنی قوم پر یہ واضح کیا کہ وہ اس کائنات کی جن چیزوں کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کر رہی ہے وہ ساری چیزیں خود اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہیں کہ وہ ملکوتِ الٰہی کے تابع اور اس کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ سر مو ادھر ادھر ان سے تجاوز کر سکیں۔ اس وجہ سے عبادت کا اصلی مستحق وہ ہے جو ان سب کا خالق و فاطر ہے نہ کہ یہ جو محکوم و مقہور ہیں۔ اب ہم حضرت ابراہیمؑ کے اس استدلال کی وضاحت کریں گے لیکن اس وضاحت سے پہلے چند باتیں حضرت ابراہیمؑ کے طرز خطاب و استدلال سے متعلق سمجھ لینی ضروری ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے طرز استدلال کی بعض خصوصیات

حضرات انبیاء علیہم السلام یوں اپنی دعوت اور اپنے مقصد کے اعتبار سے تو بالکل یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے ہیں لیکن اپنے مخاطبوں کے مزاج، ان کی افتادِ طبع اور ان کے ذوق کے اختلاف کے سبب سے ہر نبی کے طرز خطاب اور طریقۂ استدلال و بحث میں کچھ امتیازی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ تر تمثیلوں میں بات کرتے تھے۔ بعض انبیا میں موعظت کا رنگ غالب ہے بعض کے ہاں قانون کا انداز نمایاں ہے۔ یہ فرق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، زیادہ تر نتیجہ ہے مخاطب کے

ذوق و مزاج کے فرق و اختلاف کا لیکن کچھ اس میں اس ذوقی رجحان کو بھی دخل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر طبیعت میں الگ الگ ودیعت فرمایا ہے۔

استدراج

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، جیسا کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، بڑی مناظرہ باز اور حجت طراز قوم تھی۔ اول تو لوگ بات سننے کے لیے آسانی سے تیار ہی نہ ہوتے اور اگر کبھی سنانے کا کوئی موقع نکلتا بھی تو بڑی جلدی بدک جاتے اور مباحثہ و مناظرہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتے۔ ان کے مزاج کی اس وحشت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ بحث و خطاب میں استدراج کا طریقہ زیادہ اختیار فرماتے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب پر اس راہ سے درجہ بدرجہ گھیرے ڈالتے جدھر سے اس کو سان گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ گھیرے میں آسکتا ہے۔ اس کی ایک مثال اس واقعہ میں موجود ہے جو سورۂ انبیاء میں بیان ہوا ہے۔ انھوں نے ایک دن موقع نکال کر قوم کے بت خانے کے سارے بت ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔ صرف بڑے بت کو سلامت چھوڑ دیا۔ جب پوچھ گچھ شروع ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ سے سوال ہوا کہ کیا یہ تمھارا فعل ہے، انھوں نے جھٹ جواب دیا کہ یہ تو اس بڑے بت کی کارستانی معلوم ہوتی ہے اور ٹوٹے ہوئے بتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے۔ اگر یہ بولتے ہیں تو اپنی مصیبت کی داستان خود ہی سنا دیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات سن کر پہلے تو سب پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا کہ فی الواقع ہم کتنے احمق ہیں کہ ایسی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہیں جو خود اپنی حفاظت سے بھی قاصر ہیں۔ جب یہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں تو بھلا ہماری حفاظت کیا کریں گی۔ اس طرح اندر سے ان کا اعتقاد متزلزل ہو گیا۔ لیکن پھر حمیت جاہلیت کے جوش میں حضرت ابراہیمؑ کی بات کا جواب دینے کی کوشش کی تو اس کوشش میں اپنی حماقت کا اعتراف بھی کر گئے۔ بولے کہ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ ان کے اس اعتراف پر حضرت ابراہیمؑ کو ایک نہایت عمدہ موقع ان کی حماقت پر توجہ دلانے کا مل گیا اور انھوں نے ایک نہایت مؤثر تقریر کی کہ تم پر افسوس ہے کہ تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ کسی نفع پر قادر ہیں نہ کسی نقصان پر۔

توریہ

اس طریقۂ استدراج کے تقاضے سے حضرت ابراہیمؑ کبھی کبھی توریہ سے بھی کام لیتے تھے۔ توریہ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی کوئی اسکیم پوری کرنے کے لیے حریف کے سامنے اپنی بات اس طرح پیش کرتے کہ بات تو بالکل صحیح ہوتی لیکن اس کے پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا کہ حریف اس سے مغالطہ میں پڑ جاتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہوشیاری کے باوجود وہ اسکیم کے بروئے کار آ جانے سے پہلے اس سے آگاہ نہ ہو پاتا۔ اس کی نہایت لطیف مثال سورۂ صافات میں ہے۔ ان شاء اللہ ہم اس پر اس کے مقام میں گفتگو کریں گے اور وہیں بعض الفاظ کی وضاحت بھی کریں گے جن کے صحیح مفہوم سے بے خبری کے باعث بہت سے لوگ نہایت افسوسناک قسم کی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے۔

مزاج

اس استدراج اور اس توریہ میں کہیں کہیں پاکیزہ ظرافت بھی شامل ہو جاتی ہے جو کچھ تو اس استدراج اور توریہ کا فطری تقاضا ہوتی ہے اس لیے کہ ہر کام ایک مخصوص انداز اور مخصوص اسلوب کا طالب ہوتا ہے اور کچھ اس میں اس لطافتِ ذوق کی نمود بھی ہوتی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے مزاج کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کی نہایت عمدہ مثالیں سورۂ انبیا اور سورۂ صافات میں آئیں گی۔

اس تمہید کے بعد اب زیرِ بحث آیات پر غور فرمائیے۔

حجتِ ابراہیمؑ کی وضاحت

ایک دن انھوں نے ایک تارے کو چمکتے دیکھا (ہو سکتا ہے کہ یہ ستارہ زہرہ ہو جس کو ان کی قوم پوجتی تھی یا کوئی اور ستارہ ہو) تو بولے کہ "ہاں بھائی یہ میرا رب ہے"۔ قرینہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ بات انھوں نے خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے اس طرح فرمائی ہو گی کہ دوسروں کے کان میں بھی پڑ جائے۔ سننے والوں نے جب ان کی زبان سے یہ بات سنی ہو گی تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا کہ چلو، یہ بھی غنیمت ہے۔ ایک ایسا شخص جو باپ دادا کے دین اور ہمارے معبودوں سے بالکل بیزار ہے جس حد تک بھی ہمارے ساتھ موافقت کر رہا ہے اسی پر قناعت کرو اور زیادہ اس کے درپے نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ یہ بات لوگوں کے کانوں میں ڈال کر خاموش ہو رہے۔ پھر جب ستارہ ڈوب گیا تو انھوں نے بالکل اسی انداز میں اپنے کو مخاطب اور دوسروں کو سناتے ہوئے کہا کہ میں ان ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ آس پاس والوں کا سابق اطمینان تو ان کی یہ بات سن کر رخصت ہو گیا ہو گا لیکن وہ اس سوچ میں ضرور پڑ گئے ہوں گے کہ اس نوجوان کا ہمارے معبودوں سے انحراف محض نوجوانی کی ترنگ اور بے قیدی و آزادی کی لاابالیانہ خواہش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی سوچ نے اس کے عقیدے کو متزلزل کر دیا ہے۔ چونکہ بات ان کو براہِ راست مخاطب کر کے تحدی کے انداز میں نہیں کہی گئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ مشتعل بھی نہیں ہوتے ہوں گے بلکہ وہ اس فکر میں پڑ گئے ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہماری بات ہی میں کوئی کمزوری ہے۔

کسی جمود کا اس حد تک ہل جانا بھی ایک بڑی کامیابی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس طرح ان کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ ان تاروں کا طلوع ہونا اور چمکنا ہی کیوں دیکھتے ہو۔ طلوع ہونے کے بعد ان کا ڈوب جانا کیوں نہیں دیکھتے؟ جب طلوع کے ساتھ غروب اور آنے کے ساتھ جانا بھی ہے اور اس پابندی اور محکومی کے ساتھ کہ مجال نہیں ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی وقت یا سمت میں یا ہیئت اور شکل میں ہرمو تغیر ہو جائے تو یہ تو گویا وہ خود زبانِ حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم آتے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں اور جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں۔ ع

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس حقیقت کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات بھی ان کے کانوں میں ڈال دی کہ خالق و مالک کے

ساتھ بندے کا تعلق محبت کی بنیاد پر ہے، نہ کہ مجرد خوف کی بنیاد پر۔ مجرد خوف ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کا کوئی حق قائم ہو جائے اور حق بھی اس کی عبادت کا۔ مشرکین کے لیے یہ بات بھی ایک نئی رہنمائی دینے والی بات تھی اس لیے کہ شرک کی بنیاد تمام تر خوف پر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے گویا بتایا کہ میں مجرد خوف کی بنیاد پر کسی کی عبادت کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ محبت کی بنا پر عبادت کرتا ہوں اور محبت کی سزاوار یہ آنی جانی چیزیں نہیں بلکہ صرف وہ ہے جس کے حکم سے یہ چیزیں آتی جاتی ہیں۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا الایۃ اسی طرح کسی دن، پورے چاند کی پھیلی ہوئی چاندنی میں انھوں نے پھر اس تعلیم کے لیے موقع پیدا کر لیا اور بالکل اسی لب ولہجہ اور اسی انداز میں انھوں نے چاند کے متعلق وہی بات کہی جو پہلے ستارے کے متعلق کہی تھی۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو انھوں نے اسی طرح اپنے کو مخاطب کرتے ہوئے اور آس پاس والوں کو سناتے ہوئے فرمایا کہ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا) غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں تعلیم کا قدم پہلے کی نسبت سے آگے ہے۔ یہاں صرف اتنی ہی بات نہیں ظاہر ہوئی کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ان ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ یہ ضلالت کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بڑے حسرت و اندوہ کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے، وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں حضرت ابراہیمؑ نے چونکہ اپنے آپ سے کہیں اس وجہ سے سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی اس کے لیے ان سے چڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور و فکر کی صلاحیت رہی ہوگی وہ اس سوچ میں پڑ گیا ہوگا کہ ایک یہ شخص ہے جو طلب ہدایت میں اس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔

ایک حقیقت کا اظہار

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے جو یہ بات فرمائی کہ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ تو یہ ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ ہدایت ہمیشہ خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے، اگر وہ ہدایت نہ دے تو کسی کو بھی ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگوں نے اس کو شرط فی الماضی کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ ان کے یہ بات کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے پہلے گمراہی میں تھے یا اپنے کو گمراہی پر سمجھتے تھے بلکہ انھوں نے اپنی فطرت سلیم کا آئینہ دوسروں کے سامنے رکھا ہے کہ وہ لوگ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھیں۔ لیکن بس آئینہ رکھ دیا ہے خود ان کو مخاطب کر کے کچھ نہیں کہا ہے کہ وہ وحشت زدہ اور بدگمان نہ ہوں۔

اسی طرح ایک دن انھوں نے سورج کے طلوع و غروب کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنا لیا۔ سورج جب آب و تاب سے نکلا اور نصف النہار پر پہنچا تو اسی انداز میں جس کا ذکر اوپر گزرا، انھوں نے سورج کے متعلق بھی وہی بات فرمائی جو تارے اور چاند کے متعلق فرمائی تھی۔ البتہ اس کے ساتھ اتنا اضافہ بھی فرما دیا کہ هٰذَآ اَكْبَرُ ' یہ

سب سے بڑا ہے؟ قرینہ صاف پتہ دے رہا ہے کہ یہ بات انھوں نے طنز، تحقیر اور استہزار کے طور پر فرمائی لیکن سننے والوں نے پھر اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو، اس سر پھرے آدمی سے یہ بھی غنیمت ہے۔ زہرہ اور چاند کو نہیں مانتا نہ سہی، ہمارے بڑے دیوتا سورج کو تو مانتا ہے لیکن ان کا یہ اطمینان بھی زیادہ دیرپا نہ ثابت ہوا آخر سورج کو بھی ڈوبنا ہی تھا، وہ بھی ڈوب گیا، جب وہ بھی ڈوب گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے بالکل کھل کر اور سب کو مخاطب کر کے حق کا اعلان فرما دیا کہ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اے میری قوم کے لوگو! تم جن چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے اپنے آپ کو بری کرتا ہوں۔ اب تک انھوں نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی نوعیت خود اپنے اوپر اپنے تاثرات کے اظہار کی تھی، اگرچہ اس سے مقصود بالواسطہ قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو بیدار کرنا ہی تھا لیکن قوم کو براہِ راست مخاطب نہیں فرمایا تھا۔ اب انھوں نے ان کو براہِ راست مخاطب کر کے ان کے دین اور ان کے معبودوں سے اپنی برأت کا اعلان فرما دیا۔

اعلانِ برأت اور توحید کا زندۂ جاوید کلمہ

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ یہ اس اعلانِ برأت کی تعبیر اور اس کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمام معبودانِ باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ اس رب کی طرف کر لیا ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ لِلَّذِیْ کا 'لِ' اس بات پر دلیل ہے کہ وَجَّهْتُ کا لفظ اَسْلَمْتُ کے مضمون پر بھی مشتمل ہے۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو بالکلیہ آسمان و زمین کے خالق و مالک کے حوالہ کر دیا۔ یہ توحید اور اسلام کی عظیم آیت اور ملتِ ابراہیمی کا کلمۂ جامعہ ہے اور ہم چونکہ اپنی نمازوں میں اسی حقیقت کا اظہار و اعتراف کرتے ہیں اس وجہ سے ان کا آغاز اسی کلمۂ جامعہ سے کرتے ہیں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۸۰-۸۲)

قوم کی طرف سے ڈراوے اور حضرت ابراہیمؑ کا جواب

'وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ' جب یہ بات یہاں تک پہنچ گئی، حضرت ابراہیمؑ نے صاف صاف نہ صرف توحید کا بلکہ شرک اور شرکا سے اپنی برأت کا بھی اعلان کر دیا تو ان کی قوم ان سے بحث و جدال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور شرک کی بنیاد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے اس وجہ سے قوم کے لوگوں نے طرح طرح سے ان کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے نفرت و بغاوت کا اعلان کرتے ہو تو ان کی پکڑ میں آجاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں فرمایا کہ تم خدا کے باب میں مجھ سے جھگڑتے ہو کہ میں تنہا اسی کو کیوں مانتا ہوں، اس کے شریک کیوں نہیں ٹھہراتا؟ اسی خدا نے تو مجھے یہ ہدایت بخشی ہے کہ اس کا کوئی شریک

نہیں ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی اور یہ بات صرف حضرت ابراہیمؑ کی قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی کوئی قوم بھی خدا کی منکر نہیں ہوئی ہے، جس نے بھی ٹھوکر کھائی ہے اس کی توحید کے باب میں ٹھوکر کھائی ہے۔ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا یہ قوم کے ڈراووں کا جواب ہے کہ میں تمھارے ان فرضی شریکوں سے ذرا نہیں ڈرتا، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تک میرا رب مجھے کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہے، نفع نقصان اسی کے اختیار میں ہے، اس کے اذن کے بغیر کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا بال بیکا کر سکے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے مجھے یہ بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی اس کی لاعلمی میں مجھے کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ یہ تم لوگ کیسی باتیں کرتے ہو، کیا تم لوگ سوچتے نہیں؟ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ میں تفویض الی اللہ کا مضمون ہے جس سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کے اعتماد پر کہہ رہا ہوں۔ یہ مضمون حضرت شعیبؑ کی زبان سے سورۂ اعراف میں بھی آیا ہے قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۸۹۔ اعراف) (اگر ہم تمھاری ملت میں پھر لوٹ گئے بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات بخشی تو یہ ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھیں گے، یہ ہم سے تو ہوگا نہیں کہ ہم پھر اس میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارا رب چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا) اس سے معلوم ہوا کہ پاک سے پاک ارادے اور سچے سے سچے عزم کی تکمیل بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر ہی منحصر ہے۔ اس وجہ سے بندے کو کوئی بات بھی مجرد اپنے عزم پر دعوے کے ساتھ نہیں کہنی چاہیے بلکہ خدا کے اعتماد پر کہنی چاہیے۔ اس لیے کہ ہر راہ میں اس کی آزمائشیں ہیں اور ان آزمائشوں میں پورا اترنا اس کی مدد اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔

اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ یعنی ڈرنا تو تمھیں چاہیے خدا کے غضب اور اس کے قہر سے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے بارے میں تمھارے پاس خدا کی اتاری ہوئی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے لیکن الٹے تم ڈرا مجھے رہے ہو۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم بھی مانتے ہو، میں بھی مانتا ہوں۔ یہ تو ایک مسلم بات ہوئی۔ اب خدا کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو خدا کے شریک و سہیم ہیں تو اس کا بارِ ثبوت تم پر ہے۔ اگر تم بے ثبوت ان کو شریک خدا بنائے بیٹھے ہو تو تم خدا کے اقراری مجرم ہو۔ اور اگر وہ تم کو اس کی سزا دے تو تم سزا کے مستحق ہو۔ میں نے کس کا جرم کیا ہے جس سے ڈروں؟ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو تو بتاؤ کہ خدا کی امان کا حقدار میں ہوں یا تم؟ لیکن یہ عجب بات ہے کہ تم چور ہو کر اُلٹے کوتوال کو ڈانٹتے ہو۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ الآیۃ ظلم سے مراد، جیسا کہ ایک سے زیادہ

توحید کی اصل حقیقت

مقامات میں ہم واضح کر آئے ہیں، شرک ہے۔ اب یہ توحید کے باب میں اصل حقیقت کا بیان ہے کہ خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ جس ایمان کے اندر شرک کی ملاوٹ ہو وہ ایمان خدا کے ہاں معتبر نہیں۔ تم امن کا ضامن اپنے شرکا کو سمجھتے ہو اور خدا سے بے نیاز ہو حالانکہ امن کے سزاوار وہ ہیں جو ہر معاملے میں صرف خدا پر اعتماد رکھتے ہیں اور شرک سے بری ہیں۔ یہی لوگ ہدایت پر ہیں اس کے سوا ہر راہ گمراہی کی راہ ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۸۳)

یہ ارتقائے فکر نہیں بلکہ ارتقائے دعوت ہے

"تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ" یہ اشارہ توحید کی اس دلیل کی طرف ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم پر قائم فرمائی اور جو اوپر تفصیل سے مذکور ہوئی۔ اس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی، اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو لوگ اس کو حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقا سمجھتے ہیں ان کا خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقا نہیں بلکہ اس کو کہہ سکتے ہیں تو ان کی دعوت کا ارتقا کہہ سکتے ہیں۔ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقاء بیان ہوا ہوتا تو 'عَلٰى قَوْمِهٖ' کے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔

یہاں چند اور باتیں بھی ذہن میں رکھیے۔

انبیاء نبوت سے پہلے بھی فطرتِ سلیم پر ہوتے ہیں

ایک یہ کہ حضرات انبیا علیہم السلام فطرتِ سلیم پر پیدا ہوتے اور فطرتِ سلیم ہی پر پروان چڑھتے ہیں۔ نبوت سے پہلے بھی ان کو کبھی توحید و شرک کے معاملے میں اشتباہ پیش نہیں آتا۔ توحید تو عہدِ فطرت ہے جو خدا نے اولادِ آدم سے ان کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی لیا ہے اور قرآن سے یہ ثابت ہے کہ اس عہد ہی کی بنا پر توحید کے معاملے میں ہر شخص عند اللہ مسئول ہو گا خواہ اسے کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ ایسی حالت میں کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی کبھی کسی شرک سے آلودہ ہو سکتا ہے[۱]۔ نبوت سے پہلے بھی حضرات انبیاء جہاں تک مبادی فطرت کا تعلق ہے بالکل فطرۃ اللہ پر ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ نخلِ فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں اس دور میں انھیں جو جستجو ہوتی ہے وہ خدا کی نہیں بلکہ خدا کی مرضیات اور اس کے احکام کی ہوتی ہے۔ یہ جستجو بھی درحقیقت ان کی فطرتِ سلیم ہی کی پیاس ہوتی ہے جو اپنے بلوغ پر بھڑکتی ہے اور سیرابی و آسودگی کی خواہاں ہوتی ہے۔ یہ سیرابی ان کو وحی کے ابرِ نیساں سے حاصل ہوتی ہے۔ انبیا کے لیے وحی کی حیثیت تاریکی کے اندر روشنی کی نہیں بلکہ روشنی

---

[۱] اس مسئلہ پر مفصل بحث سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۲ کے تحت آئے گی۔ اپنی کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید' میں بھی ایک فصل 'شرک کا اصل سبب' کے عنوان سے ہم نے اس مسئلہ پر لکھی ہے۔

کے اوپر روشنی کی ہوتی ہے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو ہم سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کا ملکوتِ الٰہی سے جو استشہاد اوپر مذکور ہوا ہے وہ نبوت سے پہلے کا نہیں بلکہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کا ہے جب انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا ہے۔ پہلے انھوں نے اپنے باپ کو دعوت دی اور یہی حضرات انبیاءؑ کی معروف سنت رہی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنے سب سے زیادہ قریبی عزیزوں کو دعوت دی ہے۔ اس کے بعد اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے سامنے بالتدریج اس طرح اعلانِ حق فرمایا جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ اس بات کی دلیل کہ یہ نبوت کے بعد کا واقعہ ہے آیات ۹۰۔ ۸۰ میں موجود ہے۔ ان آشکارا الفاظ میں یہ زندۂ جاوید کلمات ایک نبی کے سوا کون کہہ سکتا ہے۔

یہ بحث حضرت ابراہیمؑ نے نبی ہونے کے بعد پیش کی ہے

تیسری یہ کہ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقا ہوتا تو واقعات کی یہ ترتیب بالکل خلاف فطرت ماننی پڑے گی۔ آخر سب سے پہلے ان کو ایک چھوٹے سے تارے ہی نے کیوں اپنی طرف متوجہ کیا، ہر صبح کو اس کردفر سے طلوع ہونے والا سورج کہاں چلا گیا تھا؟ اس قسم کے خلاف فطرت شاہدے کے لیے پھر اس سے زیادہ خلاف فطرت یہ روایت لوگوں کو گھڑنی پڑی کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ایک غار میں ہوئی تھی، اسی میں وہ پلے اور جوان ہوئے اور جب اس سے نکلے تو شب کا وقت تھا اور پہلی چیز جس کا انھوں نے اس کائنات کی جاذب نظر چیزوں میں سے شاہدہ کیا وہ زہرہ ستارہ تھا۔

ترتیب واقعات شاہد ہے کہ یہ ارتقائے فکر نہیں ہے

چوتھی یہ کہ استدراجی طریقۂ استدلال میں متکلم اگر حریف کی کسی بات کو مانتا ہے تو ماننے کے لیے نہیں مانتا بلکہ وہ اس کو اسی داؤں پر شکست دینا چاہتا ہے جس کو حریف اپنا خاص داؤں سمجھتا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ نے انبیاء کے مکذبین کے لیے اپنی جس سنتِ استدراج کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے اس کی بھی خاص خصوصیت یہی بیان ہوئی کہ اللّٰہ تعالیٰ وہیں سے ان کو دھر لیتا ہے جہاں سے ان کو اپنی کامیابی و فتح مندی کا غرہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم اگر سورج، چاند، زہرہ کی پرستش کرتی تھی تو آخر اس کے نزدیک ان کی خدائی کی دلیل کیا تھی؟ یہی نا کہ وہ طلوع ہوتے اور چمکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی کو پکڑ لیا کہ اگر طلوع ہونا اور چمکنا ہی ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو آؤ ان کا ڈوبنا اور تاریک ہونا بھی دیکھ لو اور بتاؤ تمھاری وہ دلیل کہاں گئی! نفسیات انسانی کا یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جن کی خدائی کی دلیل ان کے وقتی کروفر ہی سے اخذ کی گئی ہو ان کی بے ثباتی اور ناپائداری پر سب سے مؤثر تقریر کا وقت وہی ہوتا ہے جب ان کی لاش ان کے پرستاروں کے سامنے پڑی ہو۔

استدراجی طریقۂ استدلال کی ایک خصوصیت

پانچویں یہ کہ انبیاء کے طریقۂ کار اور خطاب و استدلال میں، استدراج، مزاح، طنز، توریہ اور تدریج وغیرہ کے انداز جو کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر اسلوب کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک وقفہ، جو بظاہر ٹھہراؤ ہوتا

برمحل جائے وہر نکتہ مکانے دارد

ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کرا دیتا ہے اور ایک دلآویز طنز، جو بظاہر طنز ہوتا ہے، ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ خدا نے چاہا تو قرآن کے آخری گروپ میں دعوتِ انبیا کے یہ نفسیاتی پہلو تفصیل سے زیرِ بحث آئیں گے۔

ملکوتِ الٰہی میں تفکر کی برکتیں

'نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ' 'درجات' جمع بھی ہے اور اس پر تنوین بھی ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ اوپر 'وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ' کے تحت ہم نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اسی کی تعبیر یہ دوسرے الفاظ میں ہے کہ جو لوگ ملکوتِ الٰہی پر غور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی طرح علم و معرفت اور ایمان و یقین میں ان کے مدارج بلند کرتا جاتا ہے۔ حکیم و علیم کی صفات کا یہاں حوالہ اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ نے اپنے اس 'چاہنے' کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ یعنی اس کا یہ 'چاہنا' اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے قرب کے مدارج آنکھ بند کر کے نہیں بانٹتا بلکہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے سزاوار ہوتے ہیں اور جو اس کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اس میں نہایت لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آدمی اگر عقل و فکر سے کام نہ لے تو اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو معبود بنا کر سجدے کرتا اور ان سے حاجت روائی کا امیدوار ہوتا ہے اور اگر عقل و فکر سے کام لے تو شمس و قمر اور زہرہ و مشتری سب اس کی راہ کی گرد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۸۴-۹۰)

اس دنیا میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے رفع ذکر کی سرفرازی

اوپر کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے ساتھ ان کے روحانی و ایمانی مدارج کا بیان ہوا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ نے ان کو اور ان کی دعوت کو رفع ذکر اور شہرتِ دوام کی عزت و سرفرازی عطا فرمائی۔ ان کی ذریت میں بڑے بڑے انبیاء اور بلند مرتبہ صالحین و مجددین اٹھے اور ان سب کا دین وہی دینِ توحید تھا جس کی دعوت ابراہیمؑ نے اور ان سے پہلے نوحؑ نے دی۔ مطلب یہ ہے کہ یہی دین تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اور تم بھی اسی دین کی دعوت دے رہے ہو۔ اگر تمھاری قوم اس کو قبول نہیں کرنا چاہتی تو تم اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ نے دوسروں کو کھڑا کر دیا ہے جو اس کے حامل بنیں گے۔ تمھیں ان کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بہرحال انھی لوگوں کے دین کی پیروی کرنی ہے جن کو اللہ کی ہدایت نصیب ہوئی۔

تو تم انھی کی پیروی کرو اور ان مخالفوں سے صاف صاف کہہ دو کہ میں تم سے کسی عوض کا طالب تو ہوں نہیں کہ اگر تم نے میری دکان سے مال نہ خریدا تو میری دکان بیٹھ جائے گی۔ میں تو تمھارے سامنے جو کچھ پیش کر رہا ہوں تمھارے لیے ایک یاددہانی ہے۔ اس کو قبول کرو تو تمھارا اپنا نفع ہے، نہ قبول کرو گے تو تم خود بھگتو گے میرا کچھ نہیں جائے گا۔

اپنی خانہ تمام آفتاب است

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ الآیۃ حضرت اسحٰقؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ پوتے ہیں۔ فرمایا کہ كُلًّا هَدَيْنَا ان میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی یعنی اسی دین توحید اور اسی صراط مستقیم کی جس کی دعوت ابراہیمؑ نے دی۔ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ یہ حضرت ابراہیمؑ سے اوپر کے سلسلۂ ہدایت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ابراہیمؑ سے پہلے نوحؑ کو بھی ہم نے اسی راستے کی ہدایت کی تھی اور اس نے اسی کی دعوت دی۔ تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے حضرت ابراہیمؑ کی تربیت بھی فرمائی تھی۔ اس پہلو سے گویا اوپر اور نیچے دونوں کی کڑیاں مل گئیں۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ میں ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف لوٹتی ہے۔ فرمایا کہ اس کی ذریت میں سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی اسی صراط مستقیم کی ہدایت سے نوازا۔

انبیاء جن کو نبوت کے ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل ہوا

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ سارے حضرات جلیل القدر انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیت بھی ان میں مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو بادشاہت یا کسی نہ کسی نوع کی سیاسی سیادت حاصل ہوئی۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انھیں یہ ہدایت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ یہ خوب کار لوگ تھے، اللہ نے ان کو جو صلاحیتیں بخشیں ان کو انھوں نے صحیح استعمال کیا تو اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا۔ گویا اس کا کوئی تعلق خاندان کی وراثت سے نہیں بلکہ تمام تر صفات و اخلاق سے تھا۔

انبیاء جن کا مشترک وصف زہد و توکل ہے

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى الآیۃ زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام مشہور پیغمبروں میں سے ہیں۔ الیاس سے مراد توریت کے ایلیا نبی ہیں۔ ان پیغمبروں کی نسبت بھی فرمایا کہ اللہ نے ان کو بھی اسی صراط مستقیم کی ہدایت بخشی جس کی ہدایت ابراہیمؑ اور دوسرے نبیوں کو بخشی۔ یہ بھی توحید اور اسلام ہی کے داعی تھے، کسی اور دین کے داعی نہیں تھے۔ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ یہ سب کے سب زمرہ صالحین ہی سے تھے۔ اس سے ایک تو وہی بات نکلی جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ یہ جو کچھ انھیں حاصل ہوا ان کے صلاح و تقویٰ کی بنا پر حاصل ہوا، دوسری بات یہ نکلی کہ یہ تھے بہر حال خدا کے صالح بندوں ہی میں سے، ان میں سے کسی کو خدائی کا مقام حاصل نہیں تھا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق گمان کیا۔ جس طرح مذکورہ بالا انبیاء میں حکومت و سیادت مشترک وصف کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح ان انبیا میں زہد، فقر اور تبتل کی شان مشترک ہے۔

'الیسع' کی تحقیق

وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا الآیۃ ان ناموں میں سے تین نام اسمٰعیلؑ، یونسؑ اور لوط تو مشہور ہیں، قرآن میں بھی ان انبیاء کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں البتہ الیسع سے ملتے جلتے دو نبیوں کے نام ہیں۔ ایک الیشع جن کا زمانہ ۸۱۳ ق.م بتایا جاتا ہے، دوسرے یسعیاہ جن کا زمانہ ۷۶۰ ق.م بتایا گیا ہے۔ پہلا نام قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ' میں اسی منصبی فضیلت کی طرف اشارہ ہے جو ہر نبی کو اس کے منصب کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ نبی چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ان انبیاء کے لیے جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ تمام انبیاء کی مشترک صفات ہیں، الگ الگ بیان کرنے سے مقصود ان کی تخصیص نہیں، محض تعدید ہے تاکہ ہر صفت پر قاری کی الگ الگ توجہ ہو جائے۔

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ الآیۃ یعنی یہ ہدایت صرف ان نبیوں تک ہی محدود نہیں رہی، ان کے باپ دادوں، ان کی آل اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کتنوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ فرمایا کہ ہم نے انھیں بھی اپنی راہ دکھائی، انھیں برگزیدہ کیا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ 'اجتباء' سے مراد یہاں وہ برگزیدگی ہے جو اللہ نے اپنی توحید اور ہدایت کی دعوت و اشاعت کے لیے ان کو بخشی۔ 'صراط مستقیم' سے مراد یہاں توحید کی راہ ہے۔ اور اس کی تنکیر یہاں تفخیم شان کے پہلو سے ہے۔

ہدایت وہ ہے جو انبیاء کو حاصل ہوئی

'ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ' یعنی یہی ہدایت جو ان تمام نبیوں کو اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی یہی اللہ کی ہدایت ہے۔ باقی اس کے سوا جتنی راہیں ہیں سب شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔ یہ راہ اللہ اپنے ان بندوں پر کھولتا ہے "جن کے لیے چاہتا ہے"۔ "جن کے لیے چاہتا ہے" سے اشارہ اس سنت اللہ کی طرف ہے جو اس نے ایمان و ہدایت کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اس کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بھی، جن کو اللہ نے یہ مرتبے عطا فرمائے اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو کے رہ جاتا۔ مجرد اس بنیاد پر ان کی برگزیدگی قائم نہ رہتی کہ یہ نوحؑ یا ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ یہ تنبیہ اہل عرب کے لیے بھی ہے اور بنی اسرائیل کے لیے بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو انھیں ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کے سبب سے حاصل ہے وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ یہ تو درکنار اگر وہ بھی شرک میں آلودہ ہو جاتے تو خدا کے ہاں ان کا بھی کوئی وزن باقی نہ رہ جاتا۔

'حکم' اور 'حکمت' کی وضاحت

'اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ الآیۃ' کتاب کے ساتھ حکمت کا لفظ قرآن میں اکثر آیا ہے۔ یہاں 'حکم' کا لفظ ہے۔ مولانا فراہیؒ اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ 'حکم' پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'حکم' سے مراد صحیح فہم اور صحیح فہم کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہی چیز جب پختہ ہو کر ایک ملکہ راسخہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو اس کو حکمت کہتے ہیں۔' حکم اور حکمت کتاب الٰہی کے لوازم میں سے ہیں اس لیے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد ہی زندگی کے معاملات میں رہنمائی دینا ہے، عام اس

ہے کہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی اور عام اس سے کہ پیش آمدہ صورتِ معاملہ صریحاً کتاب میں بیان ہوئی ہو یا اجتہاداً و استنباطاً اس کا حکم نکالنا پڑے۔ کتاب کی طرح یہ حکم بھی عطیۂ الٰہی ہے اور اسی سے کتابِ الٰہی زندگی کی ایک عملی حقیقت بنتی ہے۔ اگر حاملین کتاب اس چیز سے محروم ہو جائیں تو پھر کتاب زندگی کے معاملات و مسائل سے بے تعلق ہو کر محض ایک ایسی تاریخی دستاویز بن کے رہ جاتی ہے جو نوادرات کے کسی عجائب خانہ میں رکھی ہو۔

صحابہ کرامؓ کا عظیم رتبہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ (جن کا اوپر بیان ہوا) ہیں جن کو ہم نے کتاب، حکم اور نبوت کی نعمت سے سرفراز کیا اور انھوں نے اس نعمت کی قدر کی۔ اب انھی نعمتوں سے ہم نے تمھارے واسطہ سے (اشارہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے) ان لوگوں کو (اشارہ اہل مکہ کی طرف ہے) نوازنا چاہا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ یہ اس نعمت کی قدر کرتے لیکن یہ لوگ اس نعمت کی اگر ناقدری کرتے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو، ہم نے ایسے لوگوں کو اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیئے مقرر کر دیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ 'وَكَّلْنَا بِهَا' میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ ساتھ ضامن اور امین بنائے جانے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'بِ' اس پر دلیل ہے۔ 'قَوْمًا' سے مراد یہاں صحابہؓ کی وہ جماعت بھی ہے جو اس وقت تک داخل اسلام ہو چکی تھی اور وہ لوگ بھی ہیں جن کے لیے بعد میں اس کے حاملین میں داخل ہونا مقدر تھا، اگرچہ ان آیات کے نزول کے وقت تک وہ ان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس ٹکڑے میں صحابہؓ کی استقامت اور مستقبل میں اُمت کی کثرت کی پیشینگوئی ہے اور اس پہلو سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جو اس دور میں آپ کو دی گئی جب آپ مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہے تھے۔ الفاظ سے تقدیرِ الٰہی کا وہ اٹل فیصلہ بھی مترشح ہو رہا ہے جو اس دعوت کو فتح مند کرنے کے لیے ہو چکا ہے اور یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اس کے لیے کھڑا کر دیا ہے ان کی قلتِ تعداد پر نہ جاؤ، یہی لوگ اس دعوت کے علمبردار ہوں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے۔

یہ دعوت ہے ذکر تجارت

'أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ الآية' 'اقْتَدِهْ' میں 'ہ' وقف اور سکتہ کی ہے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی ہدایت سے سرفراز فرمایا تو تم انھی کے نقشِ قدم پر چلو اور انھی کی ہدایت کی پیروی کرو۔ رہے یہ لوگ جو مدعی تو ہیں ابراہیمؑ کے وارث ہونے کے لیکن پیروی کر رہے ہیں شیطان کی اور تمھاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان سے کہہ دو کہ میں اس پر کوئی معاوضہ تو تم سے مانگ نہیں رہا ہوں کہ تم اس کا بوجھ محسوس کر رہے ہو، میں نے اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔ اگر قبول کرو گے تو تمھارا ہی نفع ہے، رد کر دو گے تو خود محروم رہو گے۔ یہ اللہ کے دین کی دعوت ہے، یہ کوئی تجارت اور دکانداری نہیں ہے کہ تم گاہک نہ بنے تو میرا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔

ذکریٰ کے دو مفہوم

'إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ' میں 'هُوَ' کا مرجع قرآن ہے اور یہ اسی مضمون کی مزید توضیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن تو محض لوگوں کے لیے ایک تذکیر اور ایک یاددہانی ہے۔ پیغمبر نے اگر یہ یاددہانی پہنچا دی تو وہ

اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہُوا۔ اگر لوگ اس کو قبول نہیں کرتے تو اس کا انجام وہ خود دیکھیں گے۔ پیغمبر پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول ہی کر لیں۔ قرآن کے لیے 'ذِکْرٰی' کے لفظ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ کوئی اوپری اور انوکھی بات نہیں ہے بلکہ انھی حقائق کی یاد دہانی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن لوگوں نے ان کو اپنی خواہشات و بدعات کے نیچے دبا دیا ہے۔ دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ یہ اسی ہدایت الٰہی کی یاد دہانی کر رہا ہے جس کو نوحؑ، ابراہیمؑ اور تمام انبیاء لے کر آئے لیکن ان کے ساتھ نسبت کے مدعیوں نے اس ہدایت الٰہی کی جگہ مختلف ناموں سے مختلف ضلالتیں ایجاد کر لیں اور انہی ضلالتوں کو اپنے بزرگوں کا دین سمجھ بیٹھے۔ قرآن اپنی اس تذکیر سے تاریخ کے فراموش کردہ اوراق کو بھی یاد دلا رہا ہے اور فطرت کے فراموش کردہ اسباق کو بھی پس جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اُٹھائے۔

۱۳۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۱-۹۴

اوپر بیان ہوا کہ قرآن، توحید اور اسلام کی جو دعوت دے رہا ہے یہ تمام انبیا کی مشترک دعوت ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کر رہے ہیں یہ ان کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ اب آگے چند آیتوں میں ان تکذیب کرنے والوں کے رویہ پر تبصرہ فرمایا ہے اور ان کے اقوال کا حوالہ دے کر ان کی لغویت واضح کی ہے۔ ان تکذیب کرنے والوں میں پیش پیش تو قدرتی طور پر رؤسائے مکہ تھے لیکن ابتدا ہی سے یہود نے ان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے فروغ میں اصلی خطرہ وہ اپنے ہی لیے سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے ذہن میں بات تو یہ بسی ہوئی تھی کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا اجارہ ہے، اگر کوئی نبی آنے والا ہی ہے تو بنی اسرائیل میں آئے گا، اس خانوادہ سے باہر کیسے آسکتا ہے۔ اب جو یہ صورتِ حال ان کے سامنے آئی تو سخت کش مکش میں پڑ گئے کہ اس خطرے کو کیسے روکیں۔ غیر جانبدار بن کے بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا لیکن مخالفت کریں تو کس انداز سے کریں۔ اگر یہ بات کہیں کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا حصہ ہے اور تورات کی موجودگی میں اب کسی اور قرآن و کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہی تو اندیشہ تھا کہ اس سے عربوں کی حمیت بھڑکے گی اور عجب نہیں کہ اس جوش میں وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس اندیشے کی بنا پر انھوں نے اپنے دل کی بات تو دل میں رکھی لیکن آنحضرتؐ کے مخالفین کو شہ دینے کے لیے یوں کہنا شروع کر دیا کہ جو بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر خدا نے کوئی کتاب اتاری ہے بالکل بر خود غلط ہے، خدا نے کسی پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔ یہ بات وہ کہتے تو تھے اپنے مخصوص ذہنی تحفظ کے ساتھ ہی لیکن اس سیاسی مصلحت سے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، وہ اس کو ایک عام کلیہ کے رنگ میں پیش کرتے تھے۔ قرآن نے یہاں ان کی یہ شرارت بھی بے نقاب کی اور قریش کے ان

منکرین کو بھی جواب دیا جو محض اپنے غرور سیادت میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کے حلقے سے باہر بھی کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جس کو خدا کوئی شرف و عزت بخش سکتا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹۱-۹۴

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع

۱۱ ع ۱۷

ترجمۂ آیات ۹۱-۹۴

اور انھوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی جب کہ یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر بھی

کوئی چیز نہیں اتاری۔ ان سے پوچھو، وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے، جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو، اور تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا، کہہ دو اللہ ہی نے، پھر ان کو ان کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری بابرکت، تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے کی چیز کی (تاکہ تو خوش خبری دے) اور تاکہ ہوشیار کر دے ام القریٰ اور اس کے اردگرد والوں کو اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۹۱-۹۲

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے یا دعوے کرے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآنحالیکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو اور اس سے جو دعوے کرے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتار دوں گا اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ ظالم موت کی جانکنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالہ کرو، آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کرتے تھے۔ اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسا کہ ہم نے تم کو اول بار پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا سب تم نے پیچھے چھوڑا اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہارے معاملہ میں ہمارے شریک ہیں۔ تمہارا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا اور جو چیزیں تم گمان کیے بیٹھے تھے وہ سب ہوا ہو گئیں۔ ۹۳-۹۴

۱۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ (۹۱)

یہود کی ایک شرارت

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ قول کہ "اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے" یہود کا ہے۔ اگرچہ ان کے ذہن میں تو بات یہ رہی ہوگی کہ اب موسیٰ کی کتاب اور ان کی شریعت کے بعد کسی نئی کتاب و شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن یوں صاف صاف بات کہنے میں عربوں کی قومی حمیت کے بھڑکنے کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اندیشہ تھا اس وجہ سے انھوں نے اس پہلو کو بچاتے ہوئے کہہ دیا کہ خدا نے کسی پر بھی کچھ نہیں اتارا ہے کہ اپنا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور کسی کو کوئی بدگمانی بھی نہ ہو۔ یہاں جواب میں ان کے قول کا ظاہری اور باطنی دونوں ہی پہلو ملحوظ ہے۔

خلق کی ہدایت کا سامان کرنا خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

پہلے ان کے قول کے ظاہر الفاظ پر گرفت فرمائی اور اس کی تمہید یوں اٹھائی کہ انھوں نے یہ بات کہہ کر خدا کی قدردانی کا کچھ اچھا ثبوت نہیں دیا۔ اگر یہ بات اُمّی عرب کہتے تو ان کے لیے کچھ عذر ہو سکتا تھا کہ کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ ہیں اس وجہ سے ایک عامیانہ بات کہہ گزرے۔ لیکن جب یہ بات ان لوگوں نے کہی جو تمام نبیوں اور رسولوں کے وارث اور تمام کتاب و شریعت کے حامل ہونے کے مدعی ہیں تو ثابت ہوا کہ خداشناسی کے ان مدعیوں نے خدا کو بہت کم پہچانا ہے۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ جس خدا نے انسان کے اندر ودیعت کردہ ہر طلب اور ہر تقاضے کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا آخر وہ اس کے سب سے قوی داعیہ — طلب ہدایت — ہی کی تسکین و تسلی کا سامان کیوں نہ کرتا؟ اس نے ہمیں پیاس دی تو اس کی تسکین کے لیے زمین کے اندر بھی پانی کی سوتیں جاری کر دیں اور آسمان سے بھی اپنی رحمت کی گھٹائیں برسائیں پھر اس خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے کسی پر اپنی ہدایت و شریعت نہیں اتاری، ایک ایسی بات ہے جو وہی کہہ سکتے ہیں جو نہ خدا کی صفتوں سے واقف ہوں اور نہ اس کے ان افضال و عنایات سے جن کے مورد پشتہا پشت سے وہ خود رہ چکے ہیں۔

یہود کو ایک مسکت جواب

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ۔ تمہید کے بعد اب یہ ان سے سوال ہے کہ اگر خدا نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ بتاؤ کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ لے کر آئے اور جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت بن کر نازل ہوئی۔ اس کے بعد تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا (جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو) فرما کر

ان کی اس ناقدری کا بھی اظہار فرمادیا جو انھوں نے اس کتاب کی کی اور اس سے ضمناً ان کے مذکورہ بالا قول کے باطنی پہلو کا بھی ایک جواب ہوگیا کہ اگر انھوں نے یہ بات یہ پیش نظر رکھ کر کہی ہے کہ اب موسیٰ کی کتاب کے بعد کسی اور کتاب و شریعت کی ضرورت نہیں ہے تو ان کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے اس کتاب کی جو قدر کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ورق ورق کر رکھا ہے، اس کے کچھ حصہ کو تو یہ ظاہر کرتے ہیں اور زیادہ حصّے کو چھپاتے ہیں تو جو چیز روشنی اور ہدایت بن کر آئی تھی اس کے ساتھ انھوں نے جب یہ سلوک کیا تو آخر خدا اپنی مخلوق کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے کس طرح چھوڑے رکھتا اور وہ روشنی و ہدایت ان کے لیے کیوں نہ نازل فرماتا جو ان کو تاریکی سے نکالے اور گمراہی سے نجات دے۔

یہود کی اخفائے کتاب کی سازش

'قراطیس'، قرطاس کی جمع ہے 'قرطاس' لکھنے کے صحیفہ اور ورق کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ کسی چیز سے بھی بنایا گیا ہو۔ اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہوں گی جو اس زمانے میں لکھنے کے کام آتی تھیں یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ یہود نے تورات اس شکل میں جمع نہیں کی تھی جس شکل میں مسلمانوں نے قرآن کو ما بین الدفتین جمع کیا بلکہ انھوں نے اس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جزو کو الگ الگ قلمبند کیا تھا اس طرح ان کو اس کی ان تعلیمات اور پیشین گوئیوں کے چھپانے کا آسانی سے موقع مل جاتا تھا جن کو وہ اپنی خواہشات اور مصالح کے خلاف پاتے۔ جب ایک کتاب کے اجزا الگ الگ کراسوں کی شکل میں ہوں اور اس پر اجارہ داری بھی مخصوص ایک گروہ کی ہو تو وہ بڑی آسانی سے یہ کر سکتا ہے کہ اس کے جس جزو کو چاہے اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہ آنے دے۔ قرآن نے یہود پر کتابِ الٰہی کے اخفا کا جو جرم عاید کیا ہے اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی تھی اور قرآن کے اندازِ بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کتاب الٰہی کا زیادہ حصّہ یہود نے چھپا لیا تھا، صرف اس کا تھوڑا حصّہ وہ ظاہر کرتے تھے اس لیے کہ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو حصّہ چھپایا جاتا تھا وہ زیادہ تھا، اس کے معنی لازماً یہی ہوئے کہ جو حصّہ ظاہر کیا جاتا تھا وہ تھوڑا تھا۔ اپنی روشنی اور ہدایت اللہ تعالیٰ اس لیے عطا فرماتا ہے کہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں نہ اس لیے کہ وہ ڈھانک کے رکھی جائے۔ حضرت مسیح اور بعض دوسرے نبیوں نے بھی یہود کے اس اخفائے کتاب پر ان کی سرزنش کی ہے کہ تم کو چراغ اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کو طاق پر رکھو کہ پورے گھر میں روشنی پھیلے لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کے رکھا ہے۔

'وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ'، یہ جملہ بھی معناً اوپر کے استفہامیہ جملہ ہی پر عطف ہے یعنی وہ کون ہے جس نے موسیٰ کو کتاب دی جس کے ذریعہ سے تم کو وہ باتیں بتائی اور سکھائی گئیں جن کا علم نہ تم کو تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانات سے واقف ہوتے ہوئے اگر کہتے ہو کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ دیدہ دلیری کی آخری حد ہے۔

'قُلِ اللهُ، ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ' یعنی اگر یہ بھول گئے ہیں تو انھیں یہ بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا کیا ہوا ہے اور بتا دینے کے بعد ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ جس کھیل میں یہ لگے ہوئے ہیں وہ کھیل لیں تا آنکہ خدا ان کے باب میں اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۹۲)

قرآن کا مرتبہ و مقام

'وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ' اوپر کا جواب تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان کے قول کے ظاہری پہلو کو سامنے رکھ کر تھا اب یہ ان کے ذہن کے اندر چھپے ہوئے خیال کو سامنے رکھ کر جواب دیا جا رہا ہے کہ تورات کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب کیوں نازل فرمائی؟ اس کے نزول سے کیا کمی پوری ہوئی؟ اوپر والی آیت میں ضمناً یہ اشارہ ہو چکا ہے کہ تورات پر ناز کرنے والے مدعیوں نے تورات کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن وہ ایک ضمنی جواب تھا۔ اب یہ قرآن کی مستقل حیثیت اور مستقل ضرورت واضح فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو ان کے علم میں پہلی بار آئی ہو۔ یہ تو وہ کتاب مبارک ہے جس کی بشارت ابراہیمؑ کو دی گئی اور جس کی پیشین گوئی موسٰیؑ اور مسیحؑ سب نے کی ہے۔ یہ اسی بشارت براہیمی کا ظہور اور انہی پیشینگوئیوں کی تصدیق ہے جو پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں قرآن کے لیے 'مبارک' اور 'مصدق' کے الفاظ اس سند کو ظاہر کر رہے ہیں جو پچھلے صحیفوں میں اس کی موجود ہے۔ ہم بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں حوالے نقل کر آئے ہیں۔ 'مبارک' کا لفظ اس عالم گیر برکت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی بشارت حضرت ابراہیمؑ کو دی گئی تھی کہ اس کا ظہور حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے پیدا ہونے والے نبی خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے سے ہوگا۔ پیدائش باب ۲۲ میں ہے۔

> "خداوند فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا ...... اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ یہاں زمین کی ساری قوموں کے لیے جس برکت کی بشارت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول سے پوری ہوئی۔

'مصدق' کے لفظ پر ہم ایک سے زیادہ مقامات پر بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو اس کے متعلق پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ تثنیہ باب ۱۸ کے حوالہ سے حضرت موسٰیؑ کی پیشین گوئی اور یوحنا باب ۱۴ کے حوالہ سے حضرت عیسٰیؑ کی پیشینگوئی تفسیر سورہ بقرہ میں نقل ہو چکی ہے۔ ان پیشینگوئیوں سے اس کتاب کی خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ ضرورت بھی واضح ہوتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اتارنے کا پہلے سے وعدہ فرمایا۔

قرآن اہل عرب کے لیے انذار اور بشارت ہے

وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا' اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو پہلے جملہ سے نکلتا ہے یعنی اس کو ہم نے ایک تو اس مقصد سے اتارا کہ یہ اس عالم گیر رحمت و برکت کی بشارت ہو جس کی پیشین گوئی پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ دوسرے اس لیے کہ تم اس کے ذریعے سے ام القرٰی اور اس کے اردگرد کے لوگوں پر اللہ کی حجت تمام اور انھیں اچھی طرح آگاہ کر دو کہ انھوں نے اس کتاب کو اور تمھاری رسالت کو اگر قبول نہ کیا تو وہ اللہ کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ جائیں گے۔

اُمّ القرٰی کی دینی و سیاسی اہمیت

قرآن کی یہ ضرورت قریش کے تعلق سے واضح کی گئی ہے اور یہ ضرورت بھی ایک ایسی ضرورت تھی جس کا پورا ہونا ضروری تھا۔ قریش بنی اسمٰعیل کے سربراہ تھے اور ان کی مرکزی آبادی مکہ تھی۔ بنی اسمٰعیل کتاب و نبوت سے ناآشنا امی لوگ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اسمٰعیل کی نسل سے وہ ایک رسول اٹھائے گا جس سے تمام دنیا کی قومیں برکت پائیں گی۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے یہ وعدہ پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے وہ قوم اگر اس کو قبول کر لیتی ہے تو وہ قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز ہوتی ہے اور اگر اس کو رد کر دیتی ہے تو چونکہ اس پر اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے، وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسمٰعیل کے اندر مبعوث فرمایا۔ رسولوں کے باب میں سنت اللہ یہ بھی ہے کہ وہ جس قوم کے اندر بھیجے جاتے ہیں خاندانی اعتبار سے اس کے اشراف میں سے ہوتے ہیں اور وہ اپنی دعوت و انذار میں اول مخاطب قوم کے اعیان و اکابر ہی کو بناتے ہیں اسی وجہ سے آنحضرتؐ کی بعثت مکہ میں ہوئی جو اہل عرب کا دینی و سیاسی مرکز اور قریش کا مستقر تھا۔ اسی اعتبار سے اس کو یہاں ام القرٰی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صالحین اہل کتاب اور ان کی علامت

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ الاية۔ یہ اشارہ صالحین اہل کتاب کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے رہے وہ لوگ جن کے اندر سرے سے آخرت کا کوئی خوف ہی باقی نہیں رہ گیا ہے ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔ یہ لوگ اسی طرح کج بحثیوں میں پڑے رہیں گے جن میں پڑے ہوئے ہیں۔ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ یہ خوفِ آخرت رکھنے والوں کی شناخت بتادی کہ جن کے اندر آخرت کا خوف موجود ہے وہی ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون بقرہ کے شروع میں بھی گزر چکا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰي كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا

خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۹۳-۹۴)

مشرکین مکہ کی ہفوات کا جواب

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا، اہل کتاب کے مفسدین کے بعد مشرکین مکہ کے لیڈروں کی طرف توجہ فرمائی اور جو ہفوات وہ قرآن کی نسبت بکتے تھے ان کا مختصراً حوالہ دینے کے بعد ان کے انجام کی طرف ان کو توجہ دلائی۔ ان کی باتیں چونکہ بالکل لایعنی محض ان کے کبر و غرور کا مظاہرہ تھیں اس وجہ سے ان باتوں کے جواب کے بجائے اصل ضرب ان کے کبر و غرور پر لگائی۔ ان کے ذکر کا آغاز ان کے سب سے بڑے ظلم یعنی شرک کے ذکر سے فرمایا، شرک کی نسبت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا ارتکاب کر کے انسان اپنے رب کا بھی سب سے بڑا حق تلف کرتا ہے اور خود اپنے نفس کی بھی سب سے بڑی توہین کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ پھر مزید یہ کہ اللہ کے اوپر یہ جھوٹا افترا ہے اس لیے کہ مشرک محض اپنے جی سے کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنا شریک قرار دیا ہے حالانکہ اس دعوے کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

قریش کے لیڈروں کی ایک دھونس

اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ اس افترا پر مزید افترا یہ کہ قریش کے بعض اکابر یہ کہتے کہ جس وحی کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دعویٰ کرتے ہیں اس طرح کی وحی تو ان پر بھی آتی ہے اگر وہ چاہیں تو اسی طرح کا کلام وہ بھی پیش کر سکتے ہیں اس سے ان کا مقصود محض اس اثر کو اپنے عوام کے دلوں سے زائل کرنا ہوتا جو ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات سے پڑتا کہ جو کلام آپ پیش کر رہے ہیں وہ آپ کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی وحی ہے جو وہ اپنے ایک فرشتے کے ذریعے سے آپ پر نازل فرماتا ہے۔ ان مفتریوں نے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تجربہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کو ہوتا ہو، اس طرح کی وحی ہم پر بھی آتی ہے۔ ہم بھی چاہیں تو اپنی وحی پیش کر سکتے ہیں لیکن ہم چونکہ اس طرح کی چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس وجہ سے کوئی دعویٰ لے کر نہیں اٹھتے۔ دوسری جگہ ان کی یہی بات یوں نقل ہوئی ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۱ انفال) (اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، کہتے ہیں بس کرو، سن لیا، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی اسی طرح کا کلام پیش کر دیتے، یہ ہے کیا، یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے) یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اس کی زد پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو اسی طرح کی دھونس سے وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام ان کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اس قسم کی نمائشی اور ادعائی شہ زوری اصل حقیقت کے مقابل میں کیا کام دے سکتی ہے اور کتنے دن کام دے

سکتی ہے۔ بالآخر ان زبان کے سورماؤں کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔

رعونت کی پاداش میں ذلت کا عذاب

'وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ الاٰیۃ' شرط کا جواب، اس طرح کے مواقع میں حذف ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے حذف سے اس کی ہولناکی کی جو تصویر چشم تصور کے سامنے آتی ہے وہ اس کے اظہار کی صورت میں نہیں آسکتی۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن کے متعلق یہ باتیں قریش کے متمردین کہتے تھے۔ فرمایا کہ آج یہ لوگ اللہ کی کتاب کے باب میں اس رعونت کا اظہار کر رہے ہیں لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ موت کی سکرات میں گرفتار ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر ان سے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ لاؤ، اپنی جانیں حوالہ کرو، اب وقت آگیا کہ تم کو تمھارے افترا اور آیاتِ الٰہی سے تمھارے متکبرانہ اعراض کی پاداش میں تم کو ذلت کا عذاب چکھایا جائے۔ ذلت کا عذاب اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کے مقابل میں رعونت اور تکبر کا اظہار کیا۔ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ سے ان کے قول 'اوحی الی' اور ان کے شرک کی طرف اشارہ ہے کُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ میں استکبار کا لفظ اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے اس وجہ سے یہاں اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آیا ہے۔ اللہ کی کتاب سے اعراض کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ مہلک اعراض وہ ہے جو غرور اور رعونت کے سبب سے ہو۔ یہاں اسی اعراض کا ذکر ہے اور یہ ابلیس کی خاص وراثت ہے۔ قریش کے لیڈروں پر یہ بات بڑی شاق تھی کہ خدا کی طرف سے کوئی نعمت یا عزت ان کے سوا کسی اور کو حاصل ہو۔ اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو اپنا رسول بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی سردار کو بناتا۔ اسی غرور کا مظاہرہ ان کی ان باتوں سے بھی ہوا جو اوپر نقل ہوئی ہیں۔

'وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى الاٰیۃ' یہاں غائب کو حاضر کے اسلوب میں کر دیا ہے تاکہ 'وَلَوْ تَرٰۤى' میں ان کے جس انجام بد کا حوالہ دیا ہے اس کی ہولناکی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ گویا قیامت آگئی اور ان سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ دیکھو جس طرح تم دنیا میں بے سروسامان گئے تھے اسی طرح بے سروسامان آج ہمارے حضور میں حاضر ہو گئے، نہ تمھارے ساتھ وہ مال و متاع اور وہ لاؤ لشکر ہے جس کے بل پر تم اتراتے تھے اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہیں جن کو تم ہمارا ساجھی گمان کیے بیٹھے تھے اور جن سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے مقابل میں تمھارے کام آئیں گے۔ 'خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو ایک مضغۂ گوشت اور عملاً تمام صلاحیتوں سے خالی ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی تمام صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اور اس کو ان وسائل و ذرائع اور ان اموال و املاک کا مالک بناتا ہے جو اس کے لیے مقدر ہوتے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ خدا کی یہ نعمتیں پا کر وہ اس کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا اکڑنے والا اور اترانے والا بن جاتا ہے۔ پھر ایک دن آتا ہے کہ وہ اسی طرح خالی ہاتھ خدا کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے، ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کے ساتھ نہیں جاتی جن کے بل

پردہ یہاں اٹھ رہا تھا۔

لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ میں فاعل میرے نزدیک حذف ہے یعنی لَقَدْ تَّقَطَّعَ الْحَبْلُ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ اس میں اشارہ شرکاء وشفعاء کی طرف ہے یعنی یہ سب ہوا ہو جائیں گے۔

۱۵۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۹۵-۱۰۸

اوپر کا مجموعۂ آیات توحید کے مضمون پر ختم ہوا تھا۔ اسی مضمون کے تعلق سے آگے توحید کے دلائل کی مزید وضاحت ہوئی ہے۔ یہ دلائل توحید کے آفاقی دلائل ہیں جو بیان اس طرح ہوئے ہیں کہ ان سے معاد اور رسالت پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ گویا وہ پورا مضمون ایک نئے اسلوب سے سامنے آگیا ہے جو اس سورہ میں زیر بحث ہے نیز کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے اس صحیح نقطۂ نظر کی طرف بھی اس سے رہنمائی ہو رہی ہے جو اوپر حجت ابراہیمی کے سلسلہ میں واضح ہوا ہے۔ پھر اسی تعلق سے قریش کو مخاطب کر کے ان کو مناسب حال تنبیہ کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے آپ کو تسلی دی گئی ہے، مسلمانوں کو مخاطب کر کے مقتضائے وقت کے مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے سورہ اسی انداز پر چل رہی ہے۔ مرکزی مضمون، توحید، معاد، رسالت، بار بار مختلف اسلوبوں سے سامنے آتا ہے اور بار بار مخاطبین کے اعتراضات اور ان کے رویے کے تعلق سے کلام تردید یا توضیح یا تسکین یا موعظت کی طرف مڑ جاتا ہے لیکن سر رشتۂ کلام کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۵-۱۰۸

إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٩٧﴾ وَهُوَ الَّذِيْ أَنْشَأَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿٩٨﴾ وَهُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ مِنَ

السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا
نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ
وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ
اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ
یُّؤْمِنُوْنَ ﴿٩٩﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ
بَنِیْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿١٠٠﴾ بَدِیْعُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ
وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿١٠١﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ
وَّكِیْلٌ ﴿١٠٢﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ
اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿١٠٣﴾ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ
فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿١٠٤﴾ وَكَذٰلِكَ
نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾
اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ
الْمُشْرِكِیْنَ ﴿١٠٦﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ
حَفِیْظًا ۚ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ﴿١٠٧﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ
عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٨﴾

ع ١٢/٦ ١٨

ترجمۂ آیات ۹۵-۱۰۸

بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، بس وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو! وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے پھر ہر ایک کے لیے ایک مستقر اور ایک مدفن ہے، ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے انکھوے نکالے، پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں ابھاریں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کر دیتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار، باہمدگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے۔ بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۹۵-۹۹

اور انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی

اللہ تمھارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔ ۱۰۰-۱۰۳

اب تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت بخش آیتیں آچکی ہیں تو جو بصیرت سے کام لے گا اپنے ہی کو نفع پہنچائے گا اور جو اندھا بنا رہے گا اس کا وبال اسی پر آئے گا، اور میں تم پر کوئی نگران مقرر نہیں ہوں۔ اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ ۱۰۴-۱۰۵

تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کر پاتے اور ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں مقرر کیا ہے اور نہ تم ان کے ضامن ہو۔ ۱۰۶-۱۰۷

اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل کھبا رکھا ہے۔ پھر ان کے رب ہی کی طرف ان سب کا پلٹنا ہے تو وہ انھیں اس سے آگاہ کرے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۰۸

۱۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ۝ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ

الْعَلِيْمِ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۹۵-۹۷)

ایک ایک ذرہ توحید کا شاہد ہے

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، 'حَبّ' اور 'نوٰی' دانے اور گٹھلی کو کہتے ہیں۔ پہلے چھوٹی چیزوں سے آیاتِ الٰہی کے بیان کا آغاز کیا ہے، پھر کائنات کی بڑی چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا کہ ایک چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی پر بھی خدا کے سوا کسی اور کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ ان کو پھاڑ کر ان کے اندر سے انکھوے نکالے، پھر ان کو پودے اور درخت بنا دے۔ یہ خدا ہی کی قدرت اور اس کی حکمت ہے کہ وہ ایک ایک بیج اور ایک ایک گٹھلی کے اندر صلاحیتیں ودیعت فرماتا ہے، پھر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے زمین، آسمان، ابر، ہوا، گرمی اور سردی، خزاں اور بہار سب کو امر فرماتا ہے کہ سب مل کر اس کی پرورش میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ گویا اس زمین میں نشوونما پانے والا ایک ایک دانہ اپنے وجود سے اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اسی کے تصرف سے وہ وجود میں آیا ہے جس کے تصرف میں یہ پوری کائنات ہے۔ اگر اس کائنات کی خدائی مختلف خداؤں اور دیوتاؤں میں بٹی ہوئی ہوتی اور وہ سب اپنے اپنے دائروں اور علاقوں میں خود مختار ہوتے تو اس دنیا کا نظام چلنا تو الگ رہا رائی کا ایک دانہ بھی اپنی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر سکتا تھا۔

خدا کے قانون سے کوئی باہر نہیں

'يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ' بعینہٖ یہی ٹکڑا، معمولی فرق کے ساتھ، آل عمران کی آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم بقدر ضرورت اس کی شرح کر چکے ہیں۔ یہ بے جان چیزوں سے زندگی کے اظہار اور پھر زندگی کے اوپر موت اور فنا کے طاری ہونے کی ایک جامع تعبیر ہے جس کا مشاہدہ ہم اس کائنات کے ہر گوشے میں برابر کر رہے ہیں۔ آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کے بے جان دانہ سے ہرا بھرا درخت اور لہلہاتا ہوا پودا پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی سبز و شاداب درخت اور لہلہاتے ہوئے پودے پر زردی، خشکی اور مردنی طاری ہونی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ ختم ہو جاتا ہے یہی مشاہدہ ہم انسانوں اور حیوانوں میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی، عروج اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ ایک قوم پردۂ عدم سے نکلتی ہے ساری دنیا پر چھا جاتی ہے اور پھر وہی قوم ایک دن آتا ہے کہ پردۂ عدم میں جا چھپتی ہے۔ موت اور زندگی کے اس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اس کائنات میں مالکانہ و خود مختارانہ تصرف ہے تو کسی ایک ہی گوشے میں وہ اس قانون کو باطل کیوں نہیں کر دیتا اور اگر خدا سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ یہ سب کچھ مجرد مادے یا کسی اندھی بہری طاقت کا بروز ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بروز قائم و دائم رہے، نہ اس میں کبھی انقطاع ہو، نہ اس کے رخ میں کوئی تبدیلی واقع ہو، نہ اس پر کوئی تغیر طاری ہو۔

زبان کا ایک نکتہ

یہاں زبان کا ایک نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ پہلے تو فرمایا 'يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ' لیکن دوسرے

ٹکڑے میں اسلوب بدل کر فرمایا مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال فرمایا جو صرف تصویرِ حال کا فائدہ دیتا ہے لیکن زندہ سے مردہ کو برآمد کرنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا جس کے اندر عزم اور فیصلہ کا مفہوم بھی مضمر ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ زندگی حاصل ہو جانے کے بعد کوئی جاندار بھی اپنی زندگی موت کے حوالے کرنے پر راضی نہیں ہوتا لیکن قدرت کا قانون ایسا اٹل ہے کہ وہ بہرحال اس کو موت میں تبدیل کر ہی کے رہتا ہے۔ یہ نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا کے سوا اس کائنات میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ اگر ہے کسی کا تو وہ اپنی محبوب زندگی کو موت کے پنجہ سے کیوں نہیں بچا لیتا؟ یہی مضمون سورۂ واقعہ میں یوں بیان ہوا ہے فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔۔۔۔ (اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اپنی حلق میں آئی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لوٹا لیتے، اگر تم سچے ہو)۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو انڈے اور مرغی اور انڈے کی حکایت تک محدود رکھا ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تعبیر ہے قدرت کے ان قوانین کی جو اس نے بے جان چیزوں کے اندر زندگی کے اور جاندار چیزوں کے اندر موت کے ودیعت کیے ہیں، جن کو صرف قدرت ہی بروئے کار لاتی ہے اور جن کی گرفت سے کوئی آزاد نہیں ہے۔

ایک قدم صحیح دوسرا قدم غلط

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ آگے فرمایا ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ (وہی اللہ تمہارا رب ہے) اگر اس جملے کی تفسیر اس دوسرے جملے کی روشنی میں کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں خبر محذوف ہے اور اگر اسی کو پورا جملہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب اللہ ہی کا کرشمۂ قدرت ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو؟ یہ واضح رہے کہ اہلِ عرب اللہ کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی اسی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شرک میں بھی مبتلا تھے اس لیے فرمایا کہ فکرِ سلیم کے لیے سیدھی راہ تو یہ ہے کہ جب یہ سارا تصرف اللہ ہی کا ہے تو بندہ صرف اسی کی عبادت و اطاعت کرے لیکن تمہاری عقل کہاں اوندھی ہوئی جاتی ہے کہ ایک قدم صحیح اٹھا کر پھر دوسرے رخ پر مڑ جانے ہو اور پائی ہوئی حقیقت کو گم کر دیتے ہو۔

ایک اشارہ دلیل معاد کی سمت میں

یہ آیت اگرچہ واضح طور پر تو بیانِ توحید ہی کے سیاق میں ہے لیکن اس میں ایک لطیف اشارہ معاد کی طرف بھی ہو گیا۔ اس لیے کہ جب ہم ہر قدم پر مردہ سے زندہ کو ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو اس بات پر تعجب کی کیا وجہ ہے کہ مر جانے اور گل سڑ جانے کے بعد خدا ہمیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ گٹھلی اور دانہ زمین میں سڑ گل کر اگر از سرِ نو زندہ ہو سکتے ہیں تو ہم زمین میں دفن ہو جانے کے بعد آخر اللہ کے حکم سے دوبارہ کیوں نہیں زندہ ہو سکتے؟

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (٩٦)

زمین کے بعد ایک نظر آسمان کی طرف

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا یعنی وہی خدا جس کی شانیں زمین کے اندر دفن ہونے والے دانہ اور گٹھلی کے اندر یوں نمایاں ہوتی ہیں ذرا نگاہ اُٹھا کر اس کی شانیں آسمان میں بھی دیکھو۔ وہ جس طرح گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے درخت پیدا کر دیتا ہے اسی طرح پردۂ شب کو چاک کر کے اس کے اندر سے صبح نمودار کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس نے شب کو تمھارے لیے سکون بخشنے والی اور تمھاری کلفت کو دور کرنے والی بنایا، تم اس میں دن کی ماندگی دور کرتے ہو اور تمھارے قویٰ اور اعصاب اس میں از سر نو میدانِ عمل میں اترنے کے لیے تازہ دم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ خود بخود نکل آیا کہ وہ رات کے بعد صبح اس لیے پیدا کرتا ہے کہ تم اس میں اپنی طلب و جستجو کی سرگرمیوں میں مصروف ہو سکو اور اپنی معاش کے لیے جد و جہد کر سکو۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں بیان فرمایا وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ (سورہ نبا ۹ - ۱۱) (اور ہم نے تمھاری نیند کو تمھارے لیے دافع کلفت بنایا، شب کو تمھارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصولِ معاش کی سرگرمیوں کے لیے بنایا) مطلب یہ ہے کہ صبح اور شام، دن اور رات کی اس نوعیت پر غور کرو، تمھاری عقل یہ بات باور کرتی ہے کہ صبح کا لانے والا کوئی اور ہے، شام کا لانے والا کوئی اور، دن کا پیدا کرنے والا کوئی اور ہے، رات کا پیدا کرنے والا کوئی اور، یا یہ بات قبول کرتی ہے کہ صبح اور شام، رات اور دن سب اللہ ہی کے حکم سے آتے جاتے ہیں۔ اگر دن کا خالق کوئی اور، رات کا خالق کوئی اور ہوتا تو ان دونوں میں یہ موافقت و سازگاری کون پیدا کرتا کہ رات تمھارے لیے راحت کا بستر بچھاتی اور میٹھی نیند کے لیے سکون فراہم کرتی ہے اور دن تمھارے لیے سرگرمیوں کے میدان گرم کرتا اور معاش و معیشت کی راہیں کھولتا ہے۔

ایک بے مثال منصوبہ بندی

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا دن اور رات کے بعد اب یہ رات اور دن کے اندر ظاہر ہونے والی دو بڑی نشانیوں سورج اور چاند کو لیا۔ فرمایا کہ ان کو دیکھو، ان کے لیے قدرت کا ٹھہرایا ہوا ایک ضابطہ اور ایک نظام الاوقات ہے، مجال نہیں ہے کہ بر مُو اس سے تجاوز کر سکیں۔ انہی سے دن مہینے سال معین ہوتے ہیں، انہی سے موسموں کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ ہیں تو آسمان میں لیکن پوری وفاداری اور پابندی کے ساتھ، بلا کسی تمنائے ستائش اور پروائے صلہ کے رات دن خدمت میں سرگرم ہیں زمین والوں کی۔

کائنات میں خدا کی شانیں

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ اوپر کی بیان کردہ نشانیوں سے جو حقیقت سامنے آتی ہے، یہ اسی کا بیان ہے اور انداز بیان ایسا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جو اس نظامِ کائنات پر عقلِ سلیم اور قلبِ سلیم سے غور کرتا ہے۔ جس کی عقل سلیم ہے وہ جب اس نظام اور اس کی بے پایاں برکات پر غور کرتا ہے تو بے تحاشا اس کی زبان سے یہ گواہی نکلتی ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی خدائے عزیز و علیم ہی کی ہے۔

کائنات میں توحید کے شواہد

اس چھوٹے سے فقرے کے اندر کتنی حقیقتیں مضمر ہیں۔

ایک یہ کہ یہ سورج اور چاند خدائی میں کوئی دخل نہیں رکھتے بلکہ اس کارخانۂ کائنات میں ان کی حیثیت صرف کل پرزوں کی ہے جن کو ایک عزیز و علیم نے ان کے مقام میں فٹ کیا ہے اور یہ اپنی مفوضہ خدمت پوری پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

دوسری یہ کہ یہ کارخانہ متضاد قوتوں اور مختلف دیوتاؤں کی کوئی رزمگاہ نہیں ہے بلکہ اس کے اضداد کے اندر حیرت انگیز سازگاری ہے اور ان کی یہ باہمی سازگاری اس بات کی شاہد ہے کہ ایک ہی خدائے قاہر و قیوم اور ایک ہی رب عزیز و علیم کا ارادہ اور اس کی مشیت اس پر کار فرما ہے اور اس کی ہر حرکت اور اس کا ہر سکون اسی کی مشیت کے تابع ہے۔

تیسری یہ کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ اس کے ہر گوشے سے اس کے صانع کی قدرت، حکمت اور اس کے علم کی شہادت مل رہی ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت و مقصد ہے جس کا ظہور میں آنا لابدی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک روز جزا و سزا آئے جس میں اس کی حکمت واضح ہو۔

چوتھی یہ کہ یہ دنیا کسی کباڑیے کی دکان یا کوئی مال گودام نہیں ہے جس میں کسی چیز کا بھی کوئی قرینہ نہ ہو بلکہ اس میں نہایت حیرت انگیز پلاننگ ہے، ہر چیز کے لیے اس کی متعین جگہ ہے، ہر حرکت اور گردش کے لیے معین محور و مدار ہیں، ہر عمل کے ظہور کے لیے لگے بندھے ضابطے قاعدے ہیں، ہر آزادی اور ہر پابندی کے لیے معلوم و معروف حدود و قیود ہیں۔ اس سے صاف یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس جہان کے خالق کی مرضی انسانوں کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ شتر بے مہار کی زندگی نہ گزاریں بلکہ اس کی ہدایات اور اس کے احکام کے تحت زندگی بسر کریں تاکہ ان کی زندگی اس پورے کارخانہ سے ہم آہنگ ہو۔ یہی راہ فلاح و سعادت کی راہ ہے۔ سورۂ رحمان میں ہم آیت وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ کے تحت اس نکتہ کی مزید وضاحت کریں گے۔ وہاں قرآن نے اسی آفاقی شہادت سے رسالت کی ضرورت پر استشہاد کیا ہے۔

لفظ 'تقدیر' کا مفہوم

اس آیت میں 'تقدیر' کا لفظ وہی مفہوم رکھتا ہے جو پلاننگ (PLANNING) کا مفہوم ہے 'عزیز' کی صفت خدا کی بے نہایت قدرت اور سب پر اس کی بالاتری کو اور 'علیم' کی صفت اس کے محیط کل علم کے ساتھ ساتھ اس کی بے نہایت حکمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لیے کہ علم، حکمت کو بھی مقتضی ہے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ خدا اس نظام کائنات کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بالاتر ہے۔ اس کی قدرت، اس کا علم اور اس کی حکمت سب کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ

يَّعْلَمُوْنَ (۹۷)

ستاروں کی خدمت گزاری

سورج اور چاند کے بعد ستاروں کی طرف متوجہ کیا کہ دیکھ لو، یہ خود اپنی خدمت گزاری سے شہادت دے رہے ہیں کہ خالق نے ان کو تمہاری خدمت پر مقرر کیا ہے۔ جب تم خشکی اور تری کا سفر کرتے ہو تو سمندروں اور بیابانوں میں یہ روشنی کے میناروں اور برجیوں کی طرح تمہاری کشتیوں اور تمہارے قافلوں کو سمتیں اور راستے بتاتے ہیں۔ اب یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے کہ وہ خود تو اپنے عمل سے بتا رہے ہیں کہ تمہارے خالق نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور تم ان کو خدا کی خدائی میں شریک مان کر ان کے بت کھڑے کر کے ان کی پرستش شروع کر دو۔ پھر یہ دیکھو کہ یہ ہیں تو آسمان میں لیکن شمع بیداری کی خدمت وہ تم زمین والوں کی انجام دے رہے ہیں۔ سوچو کہ زمین کا خدا الگ ہوتا اور آسمانوں کے دیوتا الگ ہوتے تو آسمان کے ستاروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کو رستہ بتانے کے لیے ساری رات دیدبانوں میں کھڑے کھڑے اپنی نیندیں خراب کرتے؟ یہ صورتِ حال تو صاف شہادت دے رہی ہے کہ زمین و آسمان سب پر ایک ہی خدا کی حکمرانی ہے اور اسی نے ان ستاروں کو تمہاری خدمت کے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم اپنے رب کے شکر گزار بنو اور اسی کی عبادت کرو۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ عرب شعرا اپنے بیابانی سفروں کی جو داستان بیان کرتے ہیں اس میں ستاروں کا ذکر ان کی رہنمائی کے پہلو سے بھی کرتے ہیں اور رات کے مختلف حصوں کے اوقات بتانے کے لیے بھی انہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ گویا وہ ان سے گھڑیوں کا کام بھی لیتے تھے اور رہنما برجیوں کا بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بعض ستاروں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ 'شعریٰ' کا حوالہ تو قرآن میں بھی آیا ہے جو موسم بہار میں طلوع ہوتا تھا۔ اسی طرح دوسرے ستارے بھی جو نکھتروں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے معبود تھے۔ بعض سعد سمجھے جاتے تھے، بعض نحس۔

حقیقت کے طالبوں کے لیے ہر قدم پر نشانیاں موجود ہیں

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ لفظ 'آیت' کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں یہ نشانی کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر نشانی اس چیز کی دلیل ہوتی ہے جس کی وہ نشانی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے معنی دلائل کے ہوں گے اور چونکہ یہاں زیر بحث خدا اور اس کی توحید اور ضمناً معاد و رسالت ہے اس وجہ سے یہاں مراد انہی کے دلائل ہوں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتی ہے اس وجہ سے یہ تو بتا دیا ہے کہ ہم نے نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے لیکن یہ نہیں واضح فرمایا کہ کس چیز کی نشانیاں واضح فرمائی ہیں۔ یہ چیز مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے کہ اس کے اندر علم کی طلب و جستجو ہوگی تو وہ ان میں اپنی ہر جستجو کا جواب پا جائے گا۔

یہاں لفظ 'آیات' کے استعمال میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے۔ منکرین قریش کے متعلق اوپر بھی بیان ہو چکا ہے اور اس مجموعۂ آیات کے خاتمہ پر بھی ذکر آئے گا کہ وہ قرآن پر ایمان لانے کے لیے یہ شرط

ٹھہراتے کہ پیغمبر کوئی نشانی دکھائیں تو وہ ایمان لائیں گے۔ نشانی سے مراد وہ کوئی محسوس معجزہ لیتے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت کو پیشِ نظر رکھ کر فرمایا کہ اگر نشانیوں کی طلب ہے تو عقل و دل کو مطمئن کرنے والی نشانیاں یہ ہم نے بیان کر دی ہیں لیکن یہ کارآمد ان کے لیے ہیں جو علم کے طالب ہیں جن کے اندر علم کی طلب نہیں ہے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔

فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں

لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ فعل ارادۂ فعل کے لیے بھی آتا ہے اس وجہ سے لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے لیے جو جاننا چاہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ ہم اپنی زبان میں بھی جب بولتے ہیں 'اُن کے لیے جو مانیں'، 'ان کے لیے جو سمجھیں'، 'ان کے لیے جو غور کریں'، تو فعل ارادۂ فعل ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ (۹۸)

توحید کی دلیل خود انسان کی خلقت میں

خارجی عالم کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب یہ انسان کی خود اس کی خلقت اور اس کے اردگرد جو سامانِ معاش و معیشت فراہم فرمایا ہے، اس کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور نسلِ انسانی کا ایک وسیع گھرانا آباد کر دیا۔ یہاں 'اَنْشَاَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف پیدا کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے اندر نشو و نما بخشنے، پروان چڑھانے اور فروغ دینے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'ایک ہی جان' سے مراد آدم ہیں جن کو تمام آسمانی مذاہب میں نسلِ انسانی کی اصل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اہلِ عرب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ فرمایا کہ یہ خدا ہی ہے جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا، اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر مردوں اور عورتوں کی ایک دنیا پیدا کر دی۔ ان میں شکلوں، صورتوں، زبانوں، لہجوں کا اگرچہ اختلاف ہے، لیکن جبلی تقاضوں اور فطری داعیات کے لحاظ سے اتفاق ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ سب کا خالق اور پروردگار ایک ہی ہے جس نے ایک ہی درخت سے یہ سارے برگ و بار پیدا کیے ہیں۔ عورت اور مرد میں بظاہر تضاد و اختلاف ہے لیکن ان دونوں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ سازگاری کے جو ظاہری و باطنی محرکات و اسباب جمع ہیں وہ زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ دونوں کا خالق و مربی ایک ہی ہے جس نے ایک مشترک مقصد کے لیے ان کو وجود بخشا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غور کرو کہ یہ ایک ہی خدا کا پیدا کیا ہوا اور ایک ہی آدم و حوا کا گھرانا ہے یا مختلف خداؤں کی پیدا کی ہوئی منتشر بھیڑ جس کے ہر گروہ کے خدا بھی الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا باوا آدم بھی جدا گانہ ہے۔

قرآن نے اسی وحدتِ اِلٰہ اور وحدتِ آدم کے عقیدے پر انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور ان لوگوں کو فساد فی الارض کا مجرم قرار دیا ہے جو معاشرے کی اس بنیاد کو ڈھانے کی کوشش کریں۔ آنے

مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ نساء کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اس کی پہلی آیت اس عقیدے کو یوں پیش کرتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ	اے لوگو، تم اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو
خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ	ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے پیدا کیا
مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا	اس کے جوڑے کو اور پھر ان دونوں سے پھیلا دیے
كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ	بے شمار مرد اور بے شمار عورتیں، اور اس اللہ سے ڈرو
تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو۔ بے شک اللہ تم پر نگران ہے۔
كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (۱۔ نساء)	

مستقر اور مستودع کا مفہوم

فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ، 'مُسْتَقَرٌّ' کے معنی قرار و سکونت کی جگہ کے ہیں اور 'مُسْتَوْدَعٌ' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز بطور ودیعت و امانت حفاظت سے رکھی جائے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں 'مستقر' سے جگہ ہے جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا بستا ہے۔ 'وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ' (بقرہ) اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقتِ خاص تک رہنے بسنے کی جگہ اور کھانا برتنا ہے۔ 'مستودع' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد وہ دفن کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے۔ جتنی زندگی اس کے لیے مقدر ہوتی ہے اتنے دن وہ گزارتا ہے اور جو رزق اس کے لیے مقدر ہوتا ہے اس سے متمتع ہوتا ہے اور اس کا یہ جینا اور خدا کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نگرانی اور اس کے علم میں ہے۔ پھر جب اس دنیا میں اس کی مدتِ حیات ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرتا ہے اور جہاں کہیں بھی دفن ہوتا ہے خدا ہی کی زمین میں دفن ہوتا ہے اور جب خدا کا حکم ہوگا زمین اس امانت کو خدا کے حوالے کر دے گی۔ جس طرح ہر شخص کا 'مستقر' خدا کے علم میں ہوتا ہے، اسی طرح اس کا 'مستودع' بھی اس کے علم میں ہوتا ہے۔ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دوسرے مقامات میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۶۔ ھود (اور نہیں ہے زمین میں کوئی جاندار مگر اللہ ہی اس کو روزی دیتا ہے، اور خدا دنیا میں اس کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور مر گئے پر اس کے سپرد کیے جانے کی جگہ کو بھی، ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے) مطلب یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد زندگی، رزق اور اسباب و وسائل سب کچھ اسی سے حاصل ہوتا ہے تو کسی غیر کو انسان اپنی امید کا مرجع کیوں بنائے؟ پھر دفن کے لیے 'مستودع' کا لفظ استعمال کر کے ایک لطیف اشارہ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی طرف بھی فرما دیا کہ انسان جب مرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ ختم ہو گیا، بلکہ وہ زمین کی تحویل میں

دے دیا جاتا ہے جہاں سے وہ پھر اٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنی شکرگزاری کا انعام پائے اگر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کا اس نے حق پہچانا ہے اور اپنی ناشکری کی سزا بھگتے اگر اس نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے۔ یہ خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے علم و حکمت کا لازمی تقاضا ہے۔

دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

'قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ' اس میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب نہایت ضدی ہیں جو بات تو سمجھنا نہیں چاہتے لیکن بہانہ یہ تراش رہے ہیں کہ ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا جا رہا ہے۔ 'علم' اور 'تفقہ' میں فرق یہ ہے کہ علم عقل و شعور کا فعل ہے اور تفقہ دل کا، چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ ارشاد ہوا ہے 'لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا' (ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان پر خدا کی نشانیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب وہ اپنی عقل اور دل کو استعمال کرتا ہے۔ جب تک وہ محسوسات کا غلام بنا رہتا ہے، اس وقت تک اس کی مثال گدھے کی ہے جو ڈنڈے کی زبان کے سوا دوسری کوئی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عقل اور دل بھی مشاہدۂ کائنات سے خدا تک اسی صورت میں پہنچتے ہیں جب ان کے اندر محسوسات سے آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ ہو۔ اگر وہ صرف محسوسات ہی پر قانع ہو جائیں اور ان کی ساری تگ و دو انہی چیزوں کے لیے رہ جائے جو اس حیات چند روزہ میں کام آنے والی ہیں تو بسا اوقات تل تو ان کو نظر آ جاتا ہے لیکن تل کی اوٹ کا پہاڑ ان سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ یہ حبِ عاجلہ کی بیماری ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے کو تو سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۹۹)

قدم قدم پر توحید اور معاد کے آثار و دلائل

اب یہ خدا کی رحمت، ربوبیت، قدرت، حکمت، توحید اور معاد کے ان آثار و دلائل کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو ہر انسان کو قدم قدم پر نظر آ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ماننا چاہے۔

'وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ' لفظ 'سماء' پر ہم دوسری جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے اور اس فضائے نیلگوں کے لیے بھی جس کو ہم آسمان کہتے ہیں۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جو آسمان سے بارش برساتا ہے اور اس سے ہر چیز کو روئیدگی بخشتا ہے۔ کلام کا آغاز غائب کے صیغہ سے فرمایا پھر اس کو 'فَاَخْرَجْنَا بِهٖ' متکلم کے صیغہ میں بدل دیا۔ اس میں رافت و عنایت اور ربوبیت کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کہ آسمان و زمین اور ابر و ہوا سب پر ہماری ہی حکومت ہے، اگر آسمان پر کسی اور کی حکومت ہوتی، زمین پر کسی اور کی تو یہ توافق کہاں سے

ظہور میں آتا کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اپنے خزانے اُگل دیتی۔ پھر اس میں ایک لطیف تلمیح آخرت کی بھی ہے۔ قرآن میں اسی بارش اور اس کے اثر سے مردہ زمین کے از سرِ نو لہلہا اُٹھنے کو متعدد مقامات میں معاد کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ جب تم ہمیشہ دیکھتے ہو کہ زمین پر ایک تنکا بھی نہیں ہوتا لیکن بارش ہوتی ہے تو اس کے اندر کی دبی ہوئی ہر چیز جاگ پڑتی ہے اور گوشہ گوشہ سبزے سے معمور ہو جاتا ہے تو مرجانے کے بعد جی اُٹھنے کو کیوں بعید سمجھتے ہو؟

ربوبیتِ عامہ کے بعد بعض اشارات ربوبیتِ خاصہ کی طرف

فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا یہ ربوبیتِ عامہ کے بعد ربوبیتِ خاصہ کا بیان ہے جس کا تعلق انسانوں سے ہے۔ پہلے غلّہ کا ذکر فرمایا جو عام ضرورت کی چیز بھی ہے اور اپنی پائیداری کے اعتبار سے ذخیرہ کیے جانے کے لائق بھی۔ فرمایا کہ انہی نباتات میں سے جن کے اندر ہم نے غلّہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، سرسبز خوشے اور بالیاں نکالتے ہیں اور اپنی قدرت و حکمت سے ان پر تہ بہ تہ دانے جما دیتے ہیں اور اس طرح تمھارے بوئے ہوئے ایک دانے پر سینکڑوں دانوں کا اضافہ کر کے ہم تمھیں لوٹا دیتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے، کسی اندھی بہری قوت کا ظہور ہے، یا کسی حکیم و قدیر اور دانا و بصیر پروردگار کی پروردگاری ہے؟ اتنے اجزائے مختلف کو اتنی تدبیر، اتنی نگہداشت اور اتنی حکمت سے استعمال کرنا اور ان کے حاصل کو تمھاری زندگی کے بقا کا ذریعہ بنا دینا ایک ربِ کریم و کارساز کے سوا اور کس کا کام ہو سکتا ہے؟

وَمِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ ان دونوں ٹکڑوں میں فعل محذوف ہے پہلے میں مجہول، دوسرے میں معروف۔ غلّہ کے بعد اب یہ پھلوں کا ذکر فرمایا اور پہلے کھجور کو لیا جس کو اہلِ عرب کے ہاں عام پھل کی حیثیت حاصل تھی۔ کھجور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ اس کے درخت، اس درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا، ہر چیز کی طرف توجہ دلا دی ہے تاکہ اس کاری گری پر انسان کی نظر پڑے جو اس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اس پر صرف کرتی ہے۔ اسی کاری گری اور صنعت پر غور کرنے سے انسان کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کا کچھ اندازہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا منشا ان قدرتوں اور حکمتوں کے اظہار سے یہی ہے کہ انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو ورنہ جہاں تک کھجور کی ضرورت مجرد غذا کے لیے ہے اس کی فراہمی کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بدرجہ ایک تناور درخت بنے، پھر ایک خاص مرحلہ میں پہنچ کر اس کے اندر گابھے اور خوشے پیدا ہوں، پھر ان کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں، پھر وہ درجہ بدرجہ پھل بنیں، پھر پک کر اور بوجھل ہو کر ان کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبانِ حال سے دعوتِ شوق دیں۔ یہ سارا اہتمام دل گواہی دیتا ہے کہ اسی لیے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت، اس کی

ربوبیت اور اس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں لیکن یہ سائنس کا عجیب اندھا پن ہے کہ اس کو حکمت تو نظر آتی ہے لیکن حکیم نظر نہیں آتا، ربوبیت تو اس کو دکھائی دیتی ہے لیکن رب کا سراغ اس کو کہیں نہیں ملتا۔ اور اس سے زیادہ عجیب معاملہ ان لوگوں کا ہے جو دیکھتے ہیں کہ کھجور کے درخت کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے پھولنے، پھلنے اور پکنے تک تمام عناصر کائنات نے اس کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا تب کہیں کھجور کا ایک خوشہ تیار ہوا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سفاہت میں مبتلا ہیں کہ یہ کائنات مختلف ارادوں اور بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزمگاہ ہے اور ان سے بھی زیادہ عجیب معاملہ ان سادہ لوحوں کا ہے جو ربوبیت اور پروردگاری کے یہ سارے سر و سامان دیکھ رہے ہیں، ان سے متمتع اور محظوظ بھی ہو رہے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے کھانے پینے، عیش کرنے کے لیے ہے۔ یہ سوال ان کے ذہن میں کبھی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ سب کچھ مہیا کرنے والے کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ ان نعمتوں کے باب میں کوئی پرسش کا دن بھی آنے والا ہے یا نہیں؟ گویا دینے والے نے حق تو ان کو سارے بخش دیے لیکن ذمہ داری ان کے اوپر کوئی بھی نہیں ڈالی۔

اشیاء میں تنوع کی حکمت

'وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ' کھجور کے بعد انگور، زیتون اور انار کا ذکر فرمایا۔ مقصود ان کے ذکر سے صرف انہی متعین پھلوں کا ذکر نہیں ہے، ان کا ذکر صرف اس پہلو سے ہوا کہ یہ اہل عرب کے معروف پھل تھے جو ان کو خود اپنے علاقے میں میسر تھے، اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا نے تمہاری ربوبیت کا جو سامان کیا ہے تو اس میں صرف روٹی ہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے فواکہ اور میوہ جات بھی ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ فواکہ بھی جو دیے تو اس میں بھی اپنی ربوبیت، اپنی رحمت، اپنی فیاضی اور اپنی قدرت و حکمت کی یہ شان دکھائی کہ ایک ایک چیز کی گوناگون اقسام و انواع، ایک دوسری سے ملتی جلتی بھی اور باہدگر شکل، رنگ، قامت، ذائقہ میں مختلف بھی، تمہارے سامنے چن دیں۔ اب سوچو کہ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ رحیم، قدیر، علیم، حکیم اور کریم پروردگار ہے یا نہیں۔ آخر تمہاری زندگی مجرد اپنے بقا کے لیے تو ان پھلوں اور ان تمام تنوعات کی محتاج نہ تھی، تم جینے کو تو خشک روٹی اور پانی سے بھی جی سکتے تھے، پھر اس نے ایسا کیوں کیا کہ تمہارے آگے اتنے گوناگون پھلوں کے انبار لگا دیے جن کی خوشبو، ذائقہ، شکل ہر چیز دل کو لبھانے والی، آنکھوں کو فریفتہ کرنے والی اور دماغ کو مست کرنے والی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر انسان اپنے خالق کی صفات کا جلوہ دیکھے اور پھر انہی صفات کے آئینہ میں اپنے ظاہر اور اپنے باطن کو سنوارے اور ان میں سے ہر نعمت اس کے اندر اس جذبۂ شکر و سپاس کو ابھارے جو خدا نے ہر انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے اور جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

'اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ'، 'اِلٰی ثَمَرِهٖ' میں ضمیر کا مرجع ہیں تو وہ ساری ہی چیزیں جن

کا اوپر ذکر گزرا لیکن ضمیر واحد اس وجہ سے ہے کہ متکلم چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لے کر ان کے پیدا ہونے سے لے کر ان کے پکنے تک کے تمام مراحل پر غور کیا جائے۔ غور و فکر کا عمل فطری طور پر یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز پر نگاہ جمائی جائے تاکہ قوتِ فکر منتشر نہ ہو گویا یہاں قرآن نے صرف غور و فکر کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ اس کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا۔ یہ واضح رہے کہ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں بھی ہیں اور کلام عرب میں بھی۔

جمع کے لیے ضمیر واحد اور اس کا فائدہ

'وَيَنْعِهٖ' کے بعد 'اِذَا اَيْنَعَ' ہمارے نزدیک حذف ہے۔ ہم دوسرے مقام میں عربی زبان کا یہ اسلوب واضح کر چکے ہیں کہ بعض اوقات ایسے متقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں جن کی مذکورہ الفاظ کے بعد کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہاں چونکہ 'اِلٰى ثَمَرِهٖ' کے بعد 'اِذَآ اَثْمَرَ' موجود تھا اس وجہ سے 'وَيَنْعِهٖ' کے بعد 'اِذَا اَيْنَعَ' کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا۔

فرمایا کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو لے کر اس کے پھلنے سے لے کر اس کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو دیکھو اور اس پر غور کرو تو خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعی، کاریگری، باریک بینی، فیض بخشی اور اس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمھارے سامنے آئیں گی کہ تم ان کو شمار نہیں کر سکو گے۔ تم ایک نشانی اور ایک معجزہ مانگتے ہو، آنکھیں ہوں تو ہر شاخ معجزہ، ہر پھول معجزہ، ہر پھل معجزہ۔ کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہکار جلوہ نما نہ ہوں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام عجائب کی نمائش کی محتاج نہ تھی، یہ بالکل سادہ اور بے رنگ حالت میں بھی وجود میں آسکتی اور باقی رہ سکتی تھی لیکن خالق کائنات نے یہ پسند فرمایا کہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی سے اس کی عظیم قدرت و حکمت اور اس کی بے نہایت رحمت و ربوبیت ظاہر ہو تاکہ انسان اس کی معرفت حاصل کرے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا شوقین ہے کہ اگر ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے مدفون کھنڈروں سے کوئی ٹوٹا ہوا مٹی کا مرتبان بھی اس کو ہاتھ آجائے تو اس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں سے وہ اس عہد کے آرٹ، اس عہد کے کلچر، اس عہد کی تہذیب، اس دور کے مذہب، اس دور کی سیاست، غرض ہر چیز پر ایک مزعومہ فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ تیار کر دے گا، دوسری طرف اس کی بلادت اور بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ خالق کائنات نے ایک ایک پتی پر اپنی حکمت کے جو دفاتر رقم فرمائے ہیں نہ ان کا کوئی حرف اس کی سمجھ میں آتا ہے نہ ان سے اسے کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

ہر ورق معرفت کردگار کا دفتر ہے

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'، فرمایا کہ جو لوگ ایمان لانا چاہیں ان کے لیے ان چیزوں کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت کے تسلیم کیے جانے کے لیے تنہا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ واضح اور ثابت ہے بلکہ اس کے لیے اول شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر اس کو قبول کرنے کا

ارادہ پایا جاتا ہو۔ دنیا کو گمراہی علم کے مخفی ہونے کے سبب سے زیادہ پیش نہیں آئی ہے بلکہ زیادہ تر عمل کا سچا اور مضبوط ارادہ مفقود ہونے سے پیش آئی ہے۔

آیت ۹۹ کے اندر بیان کردہ نشانیاں

اب آئیے ان نشانیوں پر غور کیجیے جن کی طرف آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

پہلی چیز تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اتنی حکمتوں سے یہ معمور دُنیا نہ آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، نہ یہ کسی اندھی بہری قوت کا کرشمہ ہے بلکہ اس کے ذرّے ذرّے کے اندر بے پایاں قدرت اور بے نہایت حکمت کی جو نشانیاں ہیں وہ زبانِ حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ یہ ایک قادر و قیوم اور ایک علیم و حکیم کی بنائی ہوئی دُنیا ہے۔

دوسری چیز یہ نمایاں ہوتی ہے کہ آسمان و زمین، ابر و ہوا، سورج اور چاند، نور اور ظلمت، سردی اور گرمی، بہار اور خزاں ہر چیز پر تنہا اسی قادر و قیوم کی حکمرانی ہے اس لیے کہ ہر چیز اپنے وجود، اپنے نشوونما اور اپنے بلوغ و کمال میں تمام عناصرِ کائنات کی ایک خاص تناسب کے ساتھ خدمات حاصل کرتی ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ایک ہی بالاتر ارادہ تمام کائنات پر حاوی ہو اور وہ اپنے محیط کل علم و حکمت کے تحت ان تمام عناصرِ مختلفہ کے اندر ربط و ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے استعمال کرے۔

تیسری چیز یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قدرت، علم اور حکمت سے یہ معمور کائنات اپنے ہر گوشے سے پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے جو محض اس نے اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو، جس کے اندر نیکی اور بدی، خیر اور شر، عدل اور ظلم کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اس قدرت، اس علم اور اس حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس کے خالق و مالک کا کامل عدل اور اس کی کامل رحمت ظاہر ہو۔

چوتھی چیز یہ سامنے آتی ہے کہ اس کے اندر ربِ کریم و رحیم نے ہمارے لیے بغیر ہمارے کسی استحقاق کے، محض اپنے فضل و رحمت سے جو نعمتیں اور لذتیں مہیا فرمائی ہیں اور جن سے ہم متمتع ہو رہے ہیں، یہ ہم پر ہمارے رب کی شکر گزاری اور اسی کی عبادت و اطاعت کا حق واجب کرتی ہیں۔ جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو۔ جس نے یہ حق ادا کیا ہو وہ انعام پائے اور جس نے ناشکری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتے۔

پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس پروردگار کی پروردگاری کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہمارے اندر جو طلب اور جو داعیہ بھی ودیعت فرمایا اس کا ہمارے گرد و پیش میں بہتر سے بہتر جواب مہیا فرمایا، بھوک دی تو غذا مہیا فرمائی، پیاس دی تو پانی کے دریا بہا دیے، ذائقہ بخشا تو ذوق کی ضیافت کے نت نئے سامان کیے، ذوقِ نظر بخشا تو کائنات کے گوشے گوشے کو اپنی قدرت کی نیرنگیوں کی جلوہ گاہ بنا دیا، یہ

کس طرح ممکن ہے کہ ایسی فیض بخش اور بابرکت ذات جو ہماری مادی ضرورتوں کا اس سیرچشمی اور فیاضی سے اہتمام کرے، ہماری اس جستجو کا کوئی جواب نہ پیدا کرے جو اس نے ہماری روح اور ہمارے دل کے اندر اپنی ہدایت کے لیے ودیعت فرمائی ہے؟ یہ چیز لازم ٹھہراتی ہے کہ جس طرح اس نے ہماری جسمانی بھوک اور پیاس کے لیے غذا اور پانی کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح ہماری اس روحانی تشنگی کے بجھانے کا بھی اہتمام فرمائے، یہ چیز رسالت کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ضرورت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۱۰۰-۱۰۳)

جنات کو خدائی میں شریک بنانے کا عقیدہ

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ، یعنی کائنات کی ایک ایک چیز تو خدا اور اس کی صفات سے متعلق وہ شہادتیں فراہم کر رہی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں لیکن ان لوگوں کی خرد باختگی اور سفاہت کا یہ عالم ہے کہ یہ جنات کو بھی خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں۔ اہل عرب جن چیزوں کو خدا کا شریک مانتے تھے ان میں ملائکہ، جنات، کواکب سب ہی شامل تھے۔ لیکن یہاں سب سے پہلے جنات کا ذکر کر کے قرآن نے شرک کے انتہائی گھنونے پن کو واضح کیا ہے کہ کہاں خدا کی وہ شانیں جو بیان ہوئیں اور کہاں ان لوالفضولوں کی یہ لوالفضولی کہ پیپل تلے کی بھتنی اور شیطان کو بھی خدا کا شریک بنا دیا گیا ہے۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ اہل عرب جنات کی پرستش اسی قسم کے تصورات کے تحت کرتے تھے جس قسم کے تصورات کے تحت عام طور پر جاہل کی شرک قومیں بھوت پریت کی پرستش کرتی ہیں۔ فلاں وادی کا جن، فلاں درخت کی بھتنی، فلاں ٹیلے کا بھوت، اس قسم کے توہمات ان کے اندر پھیلے ہوئے تھے اور عام طور پر ان کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان کو چڑھاوے، نذریں، قربانیاں پیش کی جاتیں اور ان کی جے پکاری جاتی۔ بعض جن تو اتنے خطرناک سمجھے جاتے کہ ان کو راضی رکھنے کے لیے، جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ کے تحت ذکر آئے گا، اولاد تک کی قربانی کی جاتی۔ غالباً یہ ظالمانہ حرکت وہ لوگ کرتے رہے ہوں گے جو اس وہم میں مبتلا ہوتے ہوں گے کہ اگر فلاں جن کو خوش کرنے کے لیے اپنے کسی بیٹے کی قربانی نہ دی تو وہ ان کی ساری اولاد کو تباہ کر دے گا۔ اس قسم کا وہم دنیا کی وحشی قوموں میں عام رہا ہے۔

شرک کی کوئی دلیل نہیں

'وَخَلَقَهُمْ' میں 'و' حالیہ ہے اور اس کی حیثیت کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کی ہے۔ یہ بات اتنی گھنونی تھی کہ بلا تاخیر اس کی تردید فرما دی کہ یہ لوگ جنوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز آخر اس کی خدائی میں شریک کیسے بن سکتی ہے؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب ساری کائنات کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ عقیدہ اصل عقیدے سے

صرف تضاد ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ تضاد نہایت بھونڈے قسم کا تھا۔ آخر خدا اپنی دنیا پیدا کر کے اس کو اپنے ہی پیدا کیے ہوئے جنوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ 'خَرَقَ الْكَذِبَ' کے معنی جھوٹ گھڑنے اور جھوٹ تراشنے کے ہیں۔ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے اور اس وہم کی بنا پر ان کی مورتیں بنا کر دیویوں کی حیثیت سے ان کی پوجا کرتے تھے۔ اگرچہ یہاں اصلاً زیر بحث مشرکین عرب ہی کے توہمات ہیں لیکن بیٹیوں کے ساتھ بیٹوں کا ذکر کر کے قرآن نے کلام میں وسعت پیدا کر دی ہے اور اس طرح ان قوموں کے عقائد کی بھی تردید ہو گئی ہے جو خدا کے لیے بیٹے مانتی تھیں جن کی ایک مثال عیسائی ہیں۔ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کا مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں وہ بغیر کسی دلیل عقلی و نقلی کے مانتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے 'بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ' جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا بدیہی تقاضا ہے۔ خدا کو مانے بغیر نہ اس کائنات کا معمہ حل ہوتا نہ عقل و فطرت کو اطمینان حاصل ہوتا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے اور یہ موحد و مشرک دونوں کے ہاں مسلم ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کائنات میں کسی اور کی بھی حصہ داری ہے تو یہ چیز دلیل کی محتاج ہے اور یہ دلیل فراہم کرنا اس فریق کی ذمہ داری ہے جو اس کا مدعی ہے۔ یہ دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ یا تو خود خدا کی طرف سے کوئی قابل اطمینان شہادت موجود ہو کہ اس نے فلاں اور فلاں کے لیے اپنی اس کائنات میں حصہ داری تسلیم کی ہے یا ان کو وہ اپنے بیٹے یا بیٹیاں مانتا ہے یا عقل و فطرت کے اندر ان کے حق میں کوئی دلیل موجود ہو۔ اگر ان دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو تو آخر کیا شامت آئی ہوئی ہے کہ مفت میں کسی کو خدا یا شریک خدا مان کر اس کی غلامی کا پٹا بھی اپنی گردن میں ڈال لیجیے۔ خدا کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اس کو تو اس لیے مانا جاتا ہے کہ اس کے مانے بغیر چارہ نہیں۔ آخر دوسروں کے ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ ان کو مانیے۔ بلا دلیل تو آدمی اپنی گز بھر زمین میں کسی کی حصہ داری تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تو آخر خدا کی خدائی اور اس کے اختیار و اقتدار میں کسی کو کس طرح حصہ دار مان لے۔

خلاف شان صفات کی نفی

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ 'سُبْحٰنَهٗ' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہ تنزیہہ کا کلمہ ہے، یعنی خدا ان باتوں سے پاک، بری اور بالا ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ بظاہر تو صرف ایک تنزیہی کلمہ ہے لیکن غور کیجیے تو اس کے اندر توحید کی بہت بڑی دلیل بھی ہے۔ عقل و فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ کسی چیز کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کی جائے جو اس کی ثابت، مسلم اور بدیہی صفات کے ضد یا منافی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی مانی ہوئی ایک حقیقت اپنے ہی دوسرے مفروضہ سے باطل ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بادشاہ ہے تو اس کی طرف غلامی کی صفات منسوب نہیں ہو سکتیں۔ فرشتہ ہے تو اس کو شیطان کی صفات سے ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو ذات خالق، مالک، قدیر، علیم اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں اس کی

ان تمام صفات کی نفی کے ہم معنی ہے جن کا ماننا ازروئے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے انسان ان تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے ان صفات کے علم کی روشنی ہی نے اس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دے دیا گیا اور اس کو بیٹوں بیٹیوں کا باپ بنا دیا گیا تو پھر وہ خدا کہاں رہا؟ پھر تو اس کے کفو و ہمسر بھی پیدا ہو گئے، اس کی ذات برادری کے شریک بھی نکل آئے اور اس کے مدمقابل اور حریف بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

'بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' 'بدیع' کے معنی ہیں عدم سے وجود میں لانے والا۔ یعنی خدا آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تب خدا تھا۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے تو کسی مخلوق کو بیٹوں بیٹیوں کا درجہ کس طرح حاصل ہوا؟ اور وہ خدا کی خدائی میں شریک کس راہ سے ہوئے؟

مشرکین کی حماقت

'اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ' یعنی خدا کے لیے اولاد ماننا ایک اس سے بھی بڑی حماقت کے لیے راہ کھولتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے لیے (نعوذ باللہ) بیوی بھی مانی جائے۔ یہ خیریت تھی کہ مشرکین عرب اپنی تمام مشرکانہ خرافات کے باوجود خدا کے لیے کوئی بیوی نہیں مانتے تھے۔ قرآن نے اسی پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ جب خدا کے کوئی بیوی نہیں اور تم بھی اس کے لیے کسی بیوی کے قائل نہیں تو پھر یہ اس کے بیٹے بیٹیاں تم نے کہاں سے کھڑے کر دیے؟ پھر تو جو بھی ہو گا، فرشتے ہوں یا جنات یا انسان، سب خدا کی مخلوق ہوئے اور جب مخلوق ہوئے تو سب کو مخلوق ہی کے درجے میں رکھو، ان میں سے کسی کو بیٹے بیٹیاں قرار دے کر خدا کی ذات اور اس کی خدائی میں کیوں شریک بنائے دے رہے ہو۔

محیط کل علم شرک کے منافی ہے

'وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ' یہ شرک اور شرکاء کی کلی نفی کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا ہی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے تو آخر وہ ضرورت کیا ہے جس کے لیے ان شرکاء کا سہارا ڈھونڈھا گیا ہے؟ یہ تصور کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا نے پیدا کرنے کو تو کر دیا لیکن اس کو ہر چیز اور ہر شخص کی خبر نہیں ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ لازماً ہر چیز کو جانتا بھی ہے۔ اسی بات کو دوسری جگہ فرمایا ہے 'اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ'، ملک ۱۴ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا) یہاں یہ بات یاد رہے کہ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کی جو پوجا کرتے تھے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کو خالق مانتے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں اور یہ اپنے پرستاروں کی ضروریات، ان کے مسائل اور ان کی آرزوؤں سے خدا کو باخبر کرتے اور اس سے منواتے ہیں۔ فرمایا کہ اس نے پیدا کیا ہے تو وہ اپنی مخلوق کی ہر چیز سے واقف بھی ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی اور کے دروازے پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔

'ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الاية' فرمایا کہ وہی خدا جس نے تمھیں پیدا کیا ہے وہی تمھارا رب بھی ہے

پھر اس کا کیا تک ہے کہ خالق تو اس کو مانو اور رب دوسروں کو بناؤ۔ وہی خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے تو امید و بیم دونوں کا مرجع اسی کو بناؤ۔

خدا کے لیے پیکر محسوس تراشنے کی ممانعت

'لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ' یعنی اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ خدا نظر تو نہیں آتا تو یہ چیز مایوس ہونے کی نہیں۔ تمہاری نگاہیں تو بے شک اس کو پکڑنے سے قاصر ہیں لیکن وہ تمہاری نگاہوں کو پالیتا ہے۔ جو اسے دیکھنا چاہتا ہے وہ تو اگرچہ اس کو نہیں دیکھ پاتا لیکن وہ ڈھونڈنے والے کو دیکھ لیتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ واعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ بہر حال تمھیں دیکھ رہا ہے)

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک و بت پرستی کے محرکات میں سے ایک اہم محرک ابتدا سے یہ بھی رہا ہے کہ نادانوں نے خدا کو کسی پیکر محسوس میں دیکھنا چاہا ہے۔ اسی چیز نے انسان اور خدا کے درمیان واسطوں اور وسیلوں کو جنم دیا۔ جب خدا کہیں آنکھوں سے نظر نہیں آیا تو نا سمجھ لوگوں نے ان چیزوں کے پیکر تراش کر ان کی پرستش شروع کر دی جن کو وہ خدا کی ذات یا صفات کا مظہر یا اس کا اوتار سمجھے۔ چنانچہ زمانۂ حال کے ہندو فلسفی بت پرستی کے جواز کی نئی توجیہ اب یہی پیش کرتے ہیں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں جن صوفیوں نے تصورِ شیخ کی بدعت اختیار کی ہے وہ بھی اپنی اس بدعت کی تائید میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ انسان چونکہ پیکرِ محسوس کا خوگر ہے اس وجہ سے تصورِ شیخ، تصورِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے یہاں یہی غلط فہمی رفع فرمائی ہے کہ خدا دیکھنے اور چھونے کی چیز نہیں ہے۔ اس سے قرب و بُعد دل کے واسطہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس کو یاد رکھے تو وہ خدا سے قریب ہوتا ہے اگر بھول جائے تو دور ہو جاتا ہے۔ اگر آدمی کی نگاہ اس کو نہیں دیکھتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس کی نگاہیں آدمی کو ہر جگہ اور ہر وقت دیکھتی ہیں اور انسان کے اعتماد کے لیے یہ بس ہے۔

'وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ' یہ اوپر کی بات کی دلیل صفات الٰہی سے بیان فرمائی کہ وہ بڑا باریک بین اور بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز کتنے ہی پردوں میں ہو اس کی نگاہیں اس تک پہنچ جاتی ہیں اور کوئی چیز کتنی ہی مخفی ہو وہ اس سے ہر آن و ہر لحظہ باخبر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کے لیے ان مزعومہ وسائط و وسائل کی ضرورت نہیں۔ تم اس کے طالب بنو وہ خود تمھیں پالے گا۔ تمہاری نگاہیں بے شک اس کو پانے سے قاصر ہیں لیکن اس کی نگاہیں تمہاری نگاہوں کو پا لینے سے قاصر نہیں ہیں۔ وہ ہر جگہ سے ان کو پالیتی ہیں۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۱۰۴-۱۰۵)

'قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ' لفظ 'بَصِيرَة' قرآن میں سوجھ بوجھ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے

اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے دلائل و براہین کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں ہے اور مراد اس سے قرآن حکیم اور اس کی آیات ہیں جو آنکھوں کے پردے ہٹا دینے والی ہیں بشرطیکہ کوئی آنکھیں کھولنا چاہے۔

'فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ' یعنی ان سے فائدہ اٹھا کر جو اپنی بصیرت کی آنکھیں کھولے گا تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو بدستور اندھا بنا رہے گا تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتے گا، اس کی کوئی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

آیت کے آخری الفاظ 'وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ' اس بات پر دلیل ہیں کہ اس آیت کی وحی براہِ راست لسانِ نبوت پر ہے۔ یوں ارشاد نہیں ہوا کہ ان لوگوں سے کہہ دو بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود براہ راست فرما دی۔ وحی کی یہ قسم روحِ نبوت کے غایت قرب و اتصال کی دلیل ہوتی ہے گویا منبع فیض کا فیضان خود زبان رسالت سے چھلک پڑتا ہے 'گفتۂ او گفتۂ اللہ بود' شاید اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ وحی کی اقسام و انواع پر ان شاء اللہ ہم کسی دوسرے مقام پر بحث کریں گے۔ مولانا فراہیؒ نے اس پر اپنے مقدمۂ تفسیر میں ایک نہایت لطیف بحث فرمائی ہے۔

'وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ' 'تصریف آیات' کی وضاحت مختلف مقامات میں ہو چکی ہے یعنی اللہ کی نشانیوں کو مختلف پہلوؤں اور گوناگوں اسلوبوں سے واضح کرنا۔ یہاں 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ توحید، معاد اور رسالت کے انھی دلائل کی طرف ہے جو اوپر تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

لفظ 'درس' کی تحقیق

'وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ' 'درس' کے اصل معنی تو گھسنے اور مٹانے کے ہیں۔ 'دَرَسَ الرَّسْمُ' کے معنی ہوں گے نشان کو مٹا دیا۔ آدمی جب کسی چیز کو کثرت سے بار بار پڑھتا ہے، بالخصوص جب اس پر انگلی رکھ کے ایک ایک حرف کو متعین کرتے ہوئے پڑھتا ہے، جیسا کہ مذہبی صحیفوں کی تلاوت کے لیے رواج ہے تو بالعموم وہ نسخے گھس جاتے ہیں۔ اس وجہ سے لفظ 'درس' کسی کتاب کو اچھی طرح بار بار کرات و مرات پڑھنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لغت میں اس بات کو یوں تعبیر کرتے ہیں 'دَرَسَ الْكِتٰبَ' 'اقبل علیہ یحفظہ'۔

کسی کتاب کو پڑھنا خود اپنے لیے بھی ہو سکتا ہے اور دوسروں کو سنانے کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں قرأت اور تلاوت کے الفاظ بھی ان دونوں ہی مفہوموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ 'وَلِیَقُوْلُوْا' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آیتیں مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ سمجھنا چاہیں تو سمجھیں اور اگر اپنی روش پر اڑے رہنا چاہیں تو کم از کم اس بات کے تو وہ قائل ہو جائیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کے سنا دیا۔ نیز اس لیے ہم ان کی اچھی طرح وضاحت کر رہے ہیں کہ جو علم کے طالب ہیں وہ ان سے علم حاصل

کریں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کے ذریعے سے وہ مخاطب قوم پر اپنی حجت تمام کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دل پکار اٹھتے ہیں کہ رسول نے احقاقِ حق کا حق ادا کر دیا، زبان سے وہ اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔ یہاں 'دَلِیَقُوۡلُوۡا' سے یہی دل کا اقرار مراد ہے۔ دل کے اقرار کے باوجود زبان و عمل سے جو قوم رسول کی تکذیب پر اڑی رہتی ہے، سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۝ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ (۱۰۶-۱۰۷)

پیغمبرﷺ کی طرف التفات

یہ پیغمبرﷺ کی طرف التفات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم وحی الٰہی پر جمے اور اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور ان مشرکین کی مخالفت کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان سے اعراض کرو اور یہ بات یاد رکھو کہ اگر اللہ اپنے دین کے معاملہ میں جبر کو پسند کرتا ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی شرک پر قائم نہ رہ سکتا۔ وہ سب کو توحید و اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلا دیتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ لوگوں کو اس معاملے میں اختیار دے کر آزمائے کہ کون توحید کی راہ اختیار کرتا ہے، کون شرک کی؟ تو جب حکمتِ الٰہی نے یہ چاہا ہے تو تم ان کے معاملے میں کیوں پریشان ہو؟ تمھاری ذمہ داری حق کو واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے اور یہ فرض تم انجام دے رہے ہو۔ تم ان کے ایمان کے ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو کہ یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش تم سے ہو اور نہ تم ان کے ایمان کے ضامن بنے ہو کہ کل کو ان کے باب میں خدا کے ہاں جواب دہی کرنی ہے۔ تم اپنا فرض انجام دو۔ جو ان کی ذمہ داری ہے وہ ان پر چھوڑو، اگر وہ اپنی ذمہ داری ادا نہ کریں گے تو اس کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

لفظ 'وکیل' کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام پر گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں یہ ضامن کے مفہوم میں ہے۔ یعنی نہ خدا نے تم کو ان پر داروغہ مقرر کیا، نہ تم ان کے ضامن بنے تو تم کیوں پریشان ہو؟

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمۡ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ مَّرۡجِعُہُمۡ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۱۰۸)

مسلمانوں کو مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

'وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ' یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک برمحل ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورۂ نساء کی آیت ۸۶ اور ۱۴۸ میں گزر چکی ہے جس طرح مذکورہ آیات سے اوپر منافقین کے رویہ پر شدت کے ساتھ تنقید ہوئی تو ساتھ ہی مسلمانوں کو ان سے سلام کلام قطع کرنے اور تعین اشخاص کے ساتھ ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت کر دی گئی کہ مبادا یہ بات اصول کے حدود سے نکل کر ذاتیات کے دائرے میں داخل ہو جائے، اسی طرح یہاں اوپر شرک اور مشرکین پر جو سخت تنقید ہوئی ہے اس کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ہدایت کر دی جائے کہ شرک کی تردید یہ رنگ نہ اختیار کرنے پائے

کہ زیادہ پرجوش مسلمان ان چیزوں کو سخت سست کہنا شروع کر دیں جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں۔ یہ ہدایت اس وجہ سے ضروری تھی کہ یہ دَور، جیسا کہ آیات سے واضح ہے، بحث کی گرماگرمی کا تھا اور بحث کی گرماگرمی میں حدود کا احترام بالعموم ملحوظ نہیں رہتا درآنحالیکہ مسلمانوں پر، جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۸ سے واضح ہے، واجب ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرنے میں سرِمُو حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اس ہدایت کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دعوت کے نقطۂ نظر سے بابرکت اور نتیجہ خیز طریقہ یہی ہے کہ بات اصول و عقائد ہی تک محدود رہے تاکہ مخاطب کے اندر کسی بیجا عصبیت کا جذبۂ جاہلی ابھرنے نہ پائے۔ اگر توحید کا تقاضائے عقل و فطرت ہونا اور شرک کا بالکل بے ثبات و بے بنیاد ہونا ثابت ہو جائے تو ان مزعومہ معبودوں کی خدائی آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہے، ان کو سب و شتم کا ہدف بنانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ برعکس اس کے اگر بحث کے جوش میں ان چیزوں کو لوگ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے، جن کی عقیدت پشتہا پشت سے مشرکین کے دلوں میں رچی بسی ہوئی تھی تو اس کا نفسیاتی اثر ان پر یہی پڑ سکتا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر نعوذ باللہ خدا کو گالیاں دینے لگتے اور پھر کوئی بات بھی سُننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہرچند مشرکین، خدا کو خدا مانتے ہیں لیکن اشتعال میں حدود کا ہوش کسے رہتا ہے؟ وہ اندھے ہو کر سارے حدود توڑ کے رکھ دیں گے بالخصوص جب کہ انہیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق کا کوئی علم بھی نہیں ہے۔

یوں بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کا کوئی تک نہیں ہے۔ اگر وہ محض خیالی اور وہمی چیزیں ہیں تو سایہ سے لڑنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر وہ فرشتوں، نبیوں اور بزرگوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں تو ان کو بُرا بھلا کہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ الغرض یہ چیز دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی غلط، عقل و انصاف کے پہلو سے بھی غلط اور سب سے زیادہ اس پہلو سے غلط ہے کہ مشرکین کے جھوٹے خداؤں کو گالیاں دینے والے درحقیقت اپنے سچے خدا کو گالیاں دلوانے کی راہ کھولتے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن میں بتوں کی بے حقیقتی، ان کی ناطاقتی اور ان کی بے بسی کی تصویر جو قرآن میں کہیں کہیں کھینچی گئی ہے وہ اس کے تحت نہیں آتی۔ اول تو روکا جس چیز سے گیا ہے وہ سب و شتم ہے نہ کہ تنقید و توضیح، دوسرے یہاں آیت میں پیش نظر وہ فرضی یا واقعی ہستیاں ہیں جن کو مشرکین معبود مان کر پکارتے تھے۔ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے الفاظ سے یہ بات خود ہی نکل رہی ہے۔

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ مطلب یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی روایات، اپنے رسوم اور اپنے معتقدات عزیز ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی علانیہ تحقیر و توہین سے وہ مشتعل ہوتی ہے۔ اس طرح کی کسی چیز پر تنقید کرتے ہوئے ناقد کو لازماً یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ معاملے کے وہی پہلو زیر بحث آئیں جو آنے چاہئیں اور اسی انداز میں آئیں جو شائستہ بحث و تنقید کے شایان شان ہے۔ وہ انداز نہیں ہونا چاہیے جو

جذبات کو مجروح کرنے والا اور دلوں کو دکھانے والا ہو۔

فطری تقاضوں کے جائز حدود کی رعایت

یہاں تَزْیِیْن کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قوم کے اندر اپنی مالوفات سے دل بستگی اور اپنی روایات ملی و اجتماعی کے لیے یہ عصبیت ایک حد تک فطری چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو قومی و ملی وحدت وجود ہی میں نہیں آسکتی۔ خاندانوں، قوموں، وطنوں کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوئی ہے۔ یہ معدوم ہو جائیں تو افراد ہوا میں اڑتے ہوئے پتوں کے مانند ہو جائیں۔ اس وجہ سے اس چیز کا ایک مقام ہے جو تقاضائے فطرت ہے اور اس کی رعایت ملحوظ ہونی چاہیے۔ اس سے تعرض اسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک یہ حق کے خلاف ہے اور اس انداز میں ہونا چاہیے جس سے خود اس کا واجبی حق مجروح نہ ہو۔ یاد ہوگا، ہم دوسرے مقام میں بحث کر آئے ہیں کہ قرآن نے باپ دادا کے طریقہ کی بھی اہمیت تسلیم کی ہے۔ بس یہ مطالبہ کیا ہے کہ اس کو ان چیزوں سے پاک کر کے اختیار کیا جائے جو اس میں عقل و فطرت اور تعلیم الٰہی کے خلاف گھس آئی ہوں۔ اسی طرح یہاں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ قوم کے عقائد و اعمال کی تطہیر تو ضروری ہے لیکن یہ کام نہایت حکمت و دانش کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ہر قوم کو اپنی روایات سے گہری وابستگی ہوتی ہے اور یہ چیز اس فطرت کے تقاضوں میں سے ہے جو خود خدا نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے اس وجہ سے یہ تو ضروری ہے کہ جو خلافِ فطرت چیز فطرت کے اندر گھس آئی ہے وہ اس سے دور کی جائے لیکن خود فطرت پر کوئی جارحانہ حملہ کرنے کی غلطی نہ کی جائے ورنہ اس سے کام بننے کے بجائے اور بگڑ جایا کرتا ہے۔

ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ الایۃ۔ پوری آیت سامنے رکھ کر اس فقرے پر غور کیجیے تو مطلب یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کو دعوت کے جوش میں اپنے حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اگر لوگ حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنی غلطیوں ہی پر مصر رہیں گے تو مجرم وہ ٹھہریں گے اور قیامت کے دن خدا کے آگے جواب دہی ان کو کرنی ہوگی، اہل ایمان پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، پھر وہ کیوں ضرورت سے زیادہ مضطرب اور اپنی ذمہ داری کے حدود سے متجاوز ہوں؟ یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی تسکین و تسلی ہے جس طرح کی تسکین و تسلی اوپر والی آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔

۱۷۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۰۹-۱۱۷

اوپر کے مجموعۂ آیات میں جیسا کہ واضح ہوا، تفصیل کے ساتھ توحید، معاد اور رسالت کے عقلی و فطری دلائل بیان ہوئے ہیں۔ اب آگے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان سارے دلائل کے بعد بھی ان کا مطالبہ یہی ہے کہ تم کوئی معجزہ دکھاؤ تو وہ ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ چیز میرے اختیار کی نہیں ہے صرف خدا کے اختیار کی ہے۔ اس کے پاس معجزات کی کمی نہیں ہے۔ وہ ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دکھا سکتا

ہے لیکن تم دنیا جہان کے معجزے دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاؤ گے اس لیے کہ ایمان نہ لانے کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ نشانیاں اور معجزات موجود نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ تمھارے دل اور تمھاری آنکھیں الٹ گئی ہیں۔ جس طرح اس کائنات کی بے شمار نشانیاں دیکھ کر تم اندھے ہی بنے رہے اسی طرح اگر اور بہت سے معجزے بھی تمھیں دکھا دیے گئے جب بھی تم اندھے ہی بنے رہو گے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس دنیا میں جاری ہے اور جس سے ہر نبی اور ہر داعیٔ حق کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ جب کسی نبی یا کسی داعیٔ حق کی دعوتِ حق بلند ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کے لیے شیاطین انس وجن بھی لازماً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو اہل حق کی آزمائش اور ان کے کھرے کھوٹے میں تمیز ہوتی ہے، دوسری طرف اہل باطل کو ڈھیل ملتی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور جو کمائی انھیں کرنی ہے کر لیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ میرے لیے تو اس قضیہ میں خدا کے سوا کسی اور کو حکم ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے ایک کتاب اتار کر حق اور باطل کے درمیان واضح فیصلہ کر دیا ہے۔ جو اہل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدائی کتاب ہے۔ اب جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ شیطان کی پیروی کر رہے ہیں، اور ان کے باب میں خدا کی وہ بات پوری ہو کے رہے گی جو اس نے شیطان کے جواب میں فرمائی تھی کہ جو تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو جہنم میں جھونک دوں گا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موقف حق پر ڈٹے رہنے کی تاکید اور معاملے کو خدا کے حوالے کرنے کی تلقین ہے —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۹-۱۱۷

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ع

۱۳ ع ۱۰ الجزء ۱۹

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ آیات ۱۰۹-۱۱۷

اور وہ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمہیں کیا پتہ کہ جب وہ آجائے گی تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم اُن کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو اُلٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے، اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔ اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مُردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے گروہ در گروہ اکٹھی کر دی جاتیں جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے لیکن ان کی اکثریت بتلائے جہل ہے۔ ۱۰۸-۱۱۱

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے اشرار کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو پُر فریب باتیں القا کرتے ہیں دھوکا دینے کے لیے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے۔ تو تم ان کو ان کی انہی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دو اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دِل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کرلیں۔ ۱۱۲-۱۱۳

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم ڈھونڈوں درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف کتاب اتاری مفصل۔ اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے حق کے ساتھ تو تم ہرگز شک میں پڑنے والوں میں سے نہ ہو جیو۔ اور تمھارے رب کی بات پوری ہوئی ٹھیک ٹھیک اور عدل کے ساتھ اور کوئی نہیں جو اس کی باتوں کو بدل سکے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اس زمین والوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اگر تم نے ان کی بات مانی تو وہ تمھیں خدا کے راستہ سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ یہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل کے تیر تکّے چلاتے ہیں۔ بے شک تیرا رب خُوب جانتا ہے ان کو جو اس کے رستے سے بھٹکے ہُوئے ہیں اور خوب جانتا ہے ان کو جو ہدایت یاب ہیں۔ ۱۱۴-۱۱۷

۱۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى

وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ○

آنحضرتؐ کے خلاف کفار کا ایک پروپیگنڈا

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا، 'جهد' کے معنی تا حدِ وسع کوشش، بھرپور جدوجہد کے ہیں 'بذل جهده' اس نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی۔ پورا زور لگا دیا۔ 'اقسموا باللّٰہ جهد ایمانهم' یعنی وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر پیغمبر کو اور مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور مان لیں گے کہ یہ معجزہ خدا کی طرف سے، اس کا دکھانے والا خدا کا رسول اور اس کی پیش کی ہوئی کتاب خدا کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زور شور کے ساتھ قسمیں کھا کھا کے یقین دلانے سے اصل مقصود ان کا وہ تو تھا نہیں جو وہ ظاہر کرتے تھے بلکہ یہ ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک پراپیگنڈا تھا۔ وہ اس سے ایک طرف تو اپنے ان ہم قوموں کو مطمئن کرنا چاہتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت سے متاثر ہو رہے تھے کہ ہم نے ایک شرط بدی ہے جو نہایت معقول ہے، اگر یہ شرط محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پوری کر دیں تو ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری طرف وہ نیک دل مسلمانوں کے دل پر یہ اثر ڈالنا چاہتے تھے کہ جب یہ سچے رسول ہیں تو آخر اس شرط کے مان لینے میں کیا مانع ہے، کیوں نہیں اس کو مان کر میدان جیت لیتے؟

کفار کو جواب اور مسلمانوں کو تسلی سنت الٰہی کی روشنی میں

'قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ' یہ جواب ہے ان کی بدی ہوئی شرط کا اور دیکھیے کتنا نازک موقع ہے لیکن جواب وہی دیا گیا جو بالکل صحیح جواب ہے۔ ذرا بھی اس میں اس اندیشے کا دخل نہیں ہے کہ اس کو سن کر حریف تالی پیٹ دے گا کہ یہ لو فتح ہماری رہی۔ خود پیغمبر کی زبان مبارک سے اعلان کرا یا کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ کر رہے ہو، یہ معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں، وہ چاہے تو ظاہر فرمائے، نہ چاہے تو نہ ظاہر فرمائے۔ اس معاملے میں مجھے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک امرِ واقعی کا بیان ہے۔ پیغمبر کا اصلی فریضہ انذار و تبشیر ہے۔ لوگوں کی طلب کے مطابق معجزے دکھانا نہ اس کے اختیار میں ہے، نہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

'وَمَا يُشْعِرُكُمْ' میں ضمیر خطاب جمع کی ہے اور روئے سخن عام مسلمانوں کی طرف ہے۔ قدرتی طور پر بحث کی اس گرما گرمی کے دور میں ان کے اندر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی ہو گی کہ جب بات اسی شرط پر آ کر ٹکی ہے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مان لیں گے تو ان کو کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں کیا معلوم کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب کیا ہے، تم سمجھتے ہو کہ ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے حالانکہ اس وقت بھی یہ نہیں مانیں گے بلکہ بدستور اپنی ضد پر اڑے ہی رہیں گے اس لیے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی جو اصل علت ہے وہ بدستور اس معجزے کے دیکھ لینے کے بعد بھی باقی رہے گی۔

نشانیوں سے ہدایت پانے کے بارے میں سنت الٰہی

'وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ' یہ اس سنت اللہ کا بیان ہے جس کے

تحت کسی کو ایمان نصیب ہوتا ہے اور کوئی اس سے محروم رہتا ہے۔ اس سنت اللہ کی وضاحت اس
کتاب میں مختلف مقامات میں ہو چکی ہے۔ اس کائنات میں بھی اور انسان کے اپنے وجود کے اندر بھی
خالق کائنات نے اپنی جو اَن گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں جو لوگ ان پر غور کرتے اور اس غور و فکر سے جو
بدیہی نتائج ان کے سامنے آتے ہیں ان کو حرزِ جاں بناتے ہیں، ان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس
کے برعکس جو لوگ یہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اندھے بہرے بنے اور اپنی خود پرستیوں میں مگن رہتے ہیں، قرآن
اور پیغمبر کی بار بار تذکیر کے بعد بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو اُلٹ
دیا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح فکر و نظر کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر بڑی سے
بڑی نشانی اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سیدھے
دیکھنے کے بجائے اُلٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے الٹی راہ چلتے ہیں ان کے دل اور ان
کی نگہ بھی کج کر دی جاتی ہے۔ پھر وہ احول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویہ ہی سے دیکھتے ہیں۔ اسی
سنت اللہ کی طرف فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں اسی معروف سنت اللہ کا
حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کیسے باور کرتے ہو کہ اگر ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا
تو یہ مومن بن جائیں گے۔ آخر وہ تمام نشانیاں جو آفاق و انفس میں موجود ہیں، جن کی طرف قرآن نے انگلی اٹھا
اٹھا کر اشارہ کیا اور ان کے مضمرات و دلائل واضح کیے جب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے دلوں اور
ان کی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنے میں کارگر نہ ہو سکی تو آخر کوئی نئی نشانی کس طرح ان کی کایا کلپ
کر دے گی، جو حجاب آج ہے وہ کل کس طرح دُور ہو جائے گا اور جو اندھا پن آج دیکھنے سے مانع ہے وہ
اس نشانی کے ظہور کے وقت کہاں چلا جائے گا، جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلا رہے ہیں اسی
طرح اس نشانی کو بھی جھٹلا دیں گے اور جو قلب ماہیت ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کی آج دیکھتے
ہو وہ قلب ماہیت اس وقت بھی اپنا عمل کرے گی۔ یہ قلب ماہیت چونکہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت
کے نتیجہ کے طور پر ظہور میں آتی ہے اس وجہ سے جس طرح بعض مواقع میں فعل 'اضلال' کو اپنی طرف منسوب
فرمایا ہے اسی طرح یہاں تقلیب قلوب و ابصار کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ 'بہٖ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔

'وَنَذَرُھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ' اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز جو ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ہے
وہ ان کا طغیان اور ان کی سرکشی ہے۔ وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ سمجھے بیٹھے ہیں اور
پیغمبر کی دعوت ان کے غرورِ نفس اور ان کے پندارِ سیادت پر شاق گزر رہی ہے۔ ان کے اس غرور کی
سزا ان کو یہ ملی ہے کہ ان کے دل اور ان کی آنکھیں خدا نے اُلٹ دی ہیں اور ان کو اسی غرور میں بھٹکنے
کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃَ وَکَلَّمَھُمُ الْمَوْتٰی وَحَشَرْنَا عَلَیْھِمْ کُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْٓا

مصدر بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی کسی شے کو سامنے سے آتے دیکھنے کے ہیں اور قبیل کی جمع بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ قرآن میں ان دونوں معنوں کے لیے نظیر موجود ہے۔ پہلے معنی کے لیے نظیر سورہ کہف میں ہے۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰی وَیَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۵۵۔ (ہدایت آچکنے کے بعد لوگوں کو ایمان لانے اور اپنے رب سے مغفرت چاہنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ ان کے بارے میں بھی خدا کی وہی سنت ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے بارے میں ظاہر ہو چکی ہے یا یہ کہ ان پر عذاب سامنے سے دڑآتا ہوا آجائے) دوسرے معنی کے لیے نظیر سورہ بنی اسرائیل میں ہے اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِیْلًا ۹۲ (یا تم لاؤ اللہ کو اور فرشتوں کو گروہ در گروہ) زیر بحث آیت میں اگرچہ بنتے دونوں معنی ہیں لیکن میں نے حَشَرْنَا اور كُلَّ شَیْءٍ کی رعایت سے ترجمے میں ترجیح دوسرے معنی کو دی ہے۔

ایمان کے لیے اصلی حجاب

یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید ہے۔ فرمایا کہ اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں، یا قبروں سے مردے نکل کر ان سے باتیں کرنے لگتے، جیسا کہ یہ مطالبہ کرتے ہیں، یا پردۂ غیب کی ساری ہی چیزیں ان کے سامنے گروہ در گروہ لا کھڑی کرتے جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے اس لیے کہ وہ طغیان جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے جب بھی باقی رہتا۔

ایمان کے باب میں سنتِ الٰہی

'اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یَجْهَلُوْنَ' ان کے ایمان لانے کی شکل صرف یہ ہے کہ اللہ یہ چاہے کہ ان کو ایمان و ہدایت بخشے اور اللہ کا کوئی چاہنا بھی اس کی ٹھہرائی ہوئی اور اس کی پسند کی ہوئی حکمت کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ ایمان و اسلام کسی کے دل میں زبردستی نہیں ٹھونستا۔ یہ نعمت وہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے قدردان ہوتے ہیں اور اس کے لیے اپنی وہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں جو خدا نے ان کے اپنے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ جب وہ ان کو استعمال کرتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو مزید توفیق ارزانی ہوتی ہے۔ رہے یہ جو معجزے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں تو یہ اپنی خواہشات و جذبات کے غلبہ سے اندھے ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ راہ کیسے کھل سکتی ہے؟

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓی اِلَیْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِیَرْضَوْهُ وَلِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (۱۱۲-۱۱۳)

اللہ تعالیٰ کی سنتِ ابتلاء

'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ' كَذٰلِكَ کا اشارہ اس مخالفانہ شورش کی طرف ہے جو اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قریش کے لیڈروں اور ان کے ہمنواؤں نے برپا کر رکھی تھی۔ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ اس صورتِ حال سے تنہا تمہی کو سابقہ پیش آیا ہے۔ تم سے پہلے جو انبیا گزرے ہیں ان کو بھی اپنے اپنے زمانوں کے شیاطین جن و انس کے ہاتھوں یہی دکھ جھیلنے پڑے ہیں۔

یہ اللہ کی سنتِ ابتلا ہے جس سے اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کو گزرنا پڑا ہے۔ اسی سے راست بازوں کی راست بازی کا امتحان ہوتا ہے اور ان کے جوہر نکھرتے ہیں اور اسی سے اہلِ باطل کو وہ مہلت ملتی ہے جس میں ان کے اندر کا فساد ظہور میں آتا ہے اور وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو آگے اسی سورہ میں یوں ادا فرمایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۱۲۳ (اور اسی طرح ہم نے ہر بستی کے اکابر مجرمین کو مہلت دی کہ وہ جو چالیں اس میں چلنا چاہتے ہیں چل لیں، اور وہ نہیں چلتے تھے کوئی چال مگر اپنے ہی ساتھ لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہوا) اہلِ ایمان کی یہ آزمائش اور اہلِ کفر کے لیے یہ ڈھیل چونکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ ابتلا کے تحت ظہور میں آتی ہے اور انسان کو اس نے اختیار وارادہ کی جو آزادی بخشی ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔

بدعات کا فریب

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ زُخْرُف کے معنی ملمع کی ہوئی بات، جھوٹی اور باطل چیز جس پر حق کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ اس سے مراد وہ مشرکانہ بدعات ہیں جو ہر دور کے شیاطین جن وانس نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایجاد کیں، پھر ان کے اوپر شریعتِ الٰہی کا لیبل لگا کر ان کو رواج دیا اور جب انبیاء و مصلحین نے ان کی اصلاح کی دعوت دی تو ان کی مخالفت میں بحث و جدال کا بازار گرم کیا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی اور ان کے بتوں اور مشرکانہ عقائد کے تحت ان کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کی بے حقیقتی واضح فرمائی تو شرک کے یہ ائمہ آستینیں چڑھا چڑھا کے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس پر ان کا زور چلا اس کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے باپ دادا کے دین اور ابراہیم کی ملت سے ہٹا رہے ہیں۔

یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں ہے کہ شرک اور باطل کا جتنا نظام بھی ہے وہ تمام تر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، شیاطینِ جن وانس کے باہمی گٹھ جوڑ سے قائم ہے۔ یہ بات تفصیل سے اپنے مقام میں واضح ہو چکی ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ کد عقیدۂ توحید سے ہے اس وجہ سے وہ اس پر ضرب لگانے کے لیے برابر نت نئے حربے اور نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتا رہتا ہے اور انسانوں میں سے جو اس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ان کے اندر غلط عقائد القا کر کے ان کے واسطے سے خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آگے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۱۲۱ (انعام) (اور شیاطین اپنے ایجنٹوں کو القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کی بات مانو گے تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے) اس گٹھ جوڑ کی مزید وضاحت آگے کی ایک اور آیت سے بھی ہو رہی ہے۔ فرمایا۔ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ

بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۔۱۲۸ - انعام (اور جس دن خدا ان سب کو جمع کرے گا اور کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو ہتھیا لیا اور جو انسانوں میں سے ان کے ساتھی بنے ہوں گے وہ بولیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے کو استعمال کیا یہاں تک کہ ہم پہنچ گئے اس مدت کو جو تو نے ہمارے لیے ٹھہرائی ہوئی تھی)

اللہ تعالیٰ کا قانونِ امتحان و آزمائش اور اس کی حکمت

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مشیت اور اس کے قانون امتحان و آزمائش کے تحت ہو رہا ہے۔ اس نے انسانوں اور جنوں کو نیکی اور بدی دونوں میں سے کسی کو اختیار کرنے کی آزادی بخشی ہے۔ اگر وہ سب کو نیکی ہی کی راہ پر چلانا چاہتا تو یہ بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی حکمت نے یہی پسند فرمایا کہ وہ اس معاملے میں جبر کے بجائے لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی دے کر ان کا امتحان کرے اور دیکھے کہ کون خدا کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون شیطان کی۔ اس قانون کے تحت باطل کے علمبرداروں، شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو بھی، اس حیاتِ چند روزہ میں مہلت ملی ہوئی ہے کہ وہ اپنی اس انتخاب کی ہوئی راہ پر چلیں۔ تو تم اپنی راہ چلو اور لوگوں کو اسی راہ کی دعوت دو اور ان لوگوں کو جو تمھاری بات سننا نہیں چاہتے ان کی من گھڑت بدعات میں پڑے رہنے دو۔ یہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ لفظ 'افترا' پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر کے واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس سے شرک اور مشرکانہ بدعات مراد ہوتی ہیں۔

وَلِتَصْغٰٓی اِلَیْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِیَرْضَوْهُ وَلِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر والے جملے سے نکلتا ہے۔ یعنی ہم نے شیاطین جن و انس کو انبیاء و صالحین کی مخالفت اور بدعات و خرافات کے القا کی یہ مہلت جو اس دنیا میں دی ہے یہ اس لیے دی ہے کہ اس سے ایک طرف حق پرستوں کی حق پرستی کا امتحان ہوتا ہے دوسری طرف باطل پرستوں کو ڈھیل ملتی ہے اور وہ ان شیاطین و اشرار کے ہاتھوں اپنا من بھاتا کھاجا پا کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس کو پسند کرتے ہیں اور اس دنیا میں جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیتے ہیں۔ یہ ڈھیل اس اختیار کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو بخشا گیا ہے اس وجہ سے یہ سنتِ الٰہی کے تحت ہے۔ ان لوگوں کی صفت یہاں اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ بتائی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیاطین و اشرار کی یہ دعوت انھی لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو آخرت کے اعتقاد سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کو مطلوب صرف یہ دنیا اور اس کا عیش ہوتا ہے اور اس کی سند ان شیاطین کے ہاتھوں ان کو مل جاتی ہے۔ 'اقتراف' کے معنی کمائی کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن میں یہ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں بری کمائی کرنے کے معنی میں ہے۔

اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا